استنبول سے رباط تک

یعنی

۱۹۲۴ء میں خلافت کی تنسیخ کے بعد سے ۱۹۶۹ء تک
عالم اسلام کے کسی متحدہ نظام یا ادارہ کے قیام کی مساعی کا
تاریخی جائزہ

تالیف
عمران این حسین
نیوجرسی، امریکہ

ترجمہ و تلخیص از محمد سردار اعوان

تقدیم از ڈاکٹر اسرار احمد
بانی تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان

مکتبہ خدام القرآن لاہور
36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون : 3-35869501
maktaba@tanzeem.org

نام کتاب ———— استنبول سے رباط تک
طبع اول تا چہارم (اکتوبر 1996ء تا جون 2012ء) ———— 4500
طبع پنجم۔ نظرثانی شدہ (جولائی 2020ء) ———— 1100
ناشر ———— ناظم نشرواشاعت' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
مقامِ اشاعت ———— 36۔کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور
فون:3-35869501 (042)
مطبع ———— شرکت پرنٹنگ پریس' لاہور
قیمت ———— 100 روپے
ISBN : 978 - 969 - 606 - 061 - 1
email:publications@tanzeem.org
website:www.tanzeem.org

ترتیب

تقدیم از قلم ڈاکٹر اسرار احمد — 5

باب اوّل

خلافت' حجاز اور سعودی قومی ریاست — 9

باب دوم

خلافت عثمانیہ کا خاتمہ — 14

باب سوم

خلافت کانفرنس قاہرہ (مئی ۱۹۲۶ء) — 18

باب چہارم

ورلڈ مسلم کانگریس مکہ (جولائی ۱۹۲۶ء) — 28

باب پنجم

اقصیٰ اسلامی کانگریس یروشلم (دسمبر ۱۹۳۱ء) — 35

باب ششم

جنگ عظیم دوم کے بعد — 45

باب ہفتم

او آئی سی کے قیام سے پہلے کے حالات — 59

باب ہشتم

رباط میں اسلامی سربراہی کانفرنس (ستمبر ۱۹۶۹ء)

اور آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس کا قیام — 69

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقدیم

از قلم: ڈاکٹر اسرار احمد

جزائر غرب الہند (ویسٹ انڈیز) میں بڑی تعداد میں ایسے لوگ آباد ہیں جو تقریباً ڈیڑھ دو سو سال قبل ہندوستان کے مشرقی صوبہ جات بالخصوص بنگال اور بہار سے نقل مکانی کر کے وہاں جا آباد ہو گئے تھے۔

راقم کے نزدیک ان کا تعلق اوّلاً بنگال کی فرائضی تحریک سے تھا اور اس کے کچھ عرصہ کے بعد تحریک شہیدین (سید احمد بریلویؒ اور شاہ اسمٰعیل شہید دہلویؒ) کے باقیات الصالحات سے۔ جنہیں انگریزوں نے ان کی ''باغیانہ'' سرگرمیوں یا دلچسپیوں کی بنا پر پکڑ پکڑ کر بحری جہازوں میں بھر کر دور و دراز کے ''کالے پانی'' یعنی جزیرہ انڈیمان کی بجائے جزائر غرب الہند میں آباد (یا صحیح تر الفاظ میں dump) کر دیا تھا۔

چند نسلیں گزر جانے کے بعد ان مسلمانوں کی پانچویں چھٹی نسل اپنے ماضی سے بالکل منقطع ہو گئی اور وہاں کے رنگ میں پوری طرح رنگی گئی۔ چنانچہ تقریباً سب کے سب باضابطہ عیسائی ہو گئے یا مذہب سے بالکل بیگانہ ہو کر وہاں کے ماحول میں جذب ہو گئے۔

یہ یقیناً ان کے اَسلاف کی نیک نیتی ہی کا ثمرہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہندوستان ہی سے تعلق رکھنے والے ایک جیّد اور نہایت باصلاحیت عالم دین اور عالمی سطح پر تبلیغ اسلام اور بالخصوص ردِ عیسائیت کی حد درجہ ماہر شخصیت مولانا شاہ عبدالعلیم میرٹھیؒ کو جزائر غرب الہند کے ان غریب الوطن اور خود فراموش مسلمانوں کی ''بازیافت'' کے لیے ''مبعوث'' فرما دیا۔ ان کے زیر اثر وہاں جو لوگ دوبارہ شعوری طور پر داخل اسلام ہوئے ان ہی کے حلقے کے ایک اہم عالم دین اور معروف دانشور جناب عمران این حسین ہیں!

مولانا شاہ عبدالعلیم میرٹھیؒ کے داماد ڈاکٹر فضل الرحمنؒ نے اپنے خسر کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے کراچی میں ایک اسلامک سنٹر یعنی علوم اسلامی کی درسگاہ قائم کی' جس میں زیادہ تر جزائر غرب الہند ہی سے نوجوان داخل اور مقیم ہو کر علم دین کی تحصیل کرتے تھے۔ چنانچہ جناب عمران این حسین بھی کشاں کشاں وہاں آ گئے اور وہاں ''علیمیہ انسٹی ٹیوٹ'' سے علوم دینیہ کی تکمیل کی۔ مزید برآں ڈاکٹر فضل الرحمنؒ نے اپنے اس انتہائی ہونہار شاگرد کی قدر افزائی کے لیے اپنی صاحبزادی بھی ان کے عقدِ نکاح میں دے دی۔

برسبیل تذکرہ چار اور امور بھی دلچسپی کا باعث ہوں گے:

(i) ایک یہ کہ مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی میرٹھیؒ کے فرزند ارجمند ہیں پاکستان کے مشہور عالم دین اور سیاسی رہنما مولانا شاہ احمد نورانی صاحب......

(ii) دوسرے یہ کہ جناب عمران این حسین صاحب کے ساتھ میرا ایک ذاتی رشتہ یہ ہے کہ میں نے جب ۶۵۔۱۹۶۴ء میں کراچی یونیورسٹی میں ایم اے اسلامیات کے سالِ اوّل کے لیے باضابطہ داخلہ لے کر جن اکابر علماء سے فیض حاصل کیا ان میں سے ایک تو مولانا افتخار احمد بلخیؒ (سابق رکن جماعت اسلامی) تھے جنہوں نے اپنی بزرگانہ زبردستی ہی سے میرا داخلہ یونیورسٹی میں کرایا تھا۔ دوسرے مولانا منتخب الحق قادریؒ (صدر شعبہ) تھے جن سے اس وقت جو مخلصانہ تعلق میرا قائم ہوا تھا' اس کا ایک نمایاں مظہر یہ ہے کہ جب پیرانہ سالی اور خرابی صحت کی بنا پر وہ کراچی میں بھی تقریباً خانہ نشین ہو چکے تھے' میری دعوت پر مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے ''محاضراتِ قرآنی'' میں شرکت کے لیے لاہور تشریف لائے تھے' جس سے لاہور کے دینی حلقوں میں تعجب کا اظہار کیا گیا تھا کہ ہم تو سمجھتے تھے کہ ڈاکٹر اسرار احمد دیوبندی ہیں' یہ تو ''بریلوی'' نکلے! اور...... تیسرے یہی ڈاکٹر فضل الرحمنؒ تھے جن سے میں نے ''ادیانِ عالم کے تقابلی مطالعہ'' کا درس حاصل کیا تھا۔

(iii) یہ کہ مولانا شاہ عبدالعلیم میرٹھیؒ اگرچہ مولانا شاہ احمد رضا خان بریلویؒ سے باضابطہ بیعت تھے' لیکن جب ۲۰۔1919ء میں جمعیت علماء ہند قائم ہوئی اور بعد ازاں عظیم

اور ہندوستان گیر تحریک خلافت چلی اور اس میں ہندوستان کے جملہ حنفی حلقوں (جیسے فرنگی محلی، خیر آبادی، دیو بندی، بدایونی، اجمیری وغیرہ) پر مستزاد اہل حدیث علماء بھی شامل ہوئے، تو اگرچہ مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلویؒ کے صاحبزادگان نے اس میں شمولیت اختیار نہیں کی، لیکن مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی نے بھرپور طور پر شرکت کی اور ثابت کر دیا کہ وہ ''فرقہ بندی'' سے بالاتر مزاج کے حامل ہیں!

(iv) اور چوتھے یہ کہ ڈاکٹر فضل الرحمنؒ کے انتقال کے بعد اسلامک سنٹر کراچی کے منتظمین نے جناب عمران این حسین کو دعوت دی کہ پاکستان منتقل ہو کر اس ادارے کی سربراہی قبول فرمالیں تو انہوں نے پوری خوش دلی کے ساتھ ''ہجرت'' اختیار کی اور کچھ عرصہ یہ ذمہ داری باحسن وجوہ نبھائی۔ (ان ہی دنوں میری بھی ان سے چند ملاقاتیں کراچی میں ہوئی تھیں، جن کے ضمن میں انہوں نے مجھے اپنے گھر پر بھی مدعو کیا تھا، جہاں ''مِن وَرَاءِ حِجاب'' مولانا شاہ احمد نورانی کی ہمشیرہ اور عمران این حسین صاحب کی خوش دامن صاحبہ سے بھی نیاز حاصل ہوا تھا)۔ لیکن ایک موقع پر جب ایک اجتماعِ عام میں انہوں نے یہ الفاظ کہہ دیے کہ ''اس سنٹر کا تعلق نہ بریلویت سے ہے نہ دیوبندیت سے!'' تو پاک و ہند کی فرقہ ورانہ تنگ نظری اسے برداشت نہ کر سکی اور انہیں ادارے کی سربراہی سے سبکدوش ہونا پڑا، جس کے بعد انہوں نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

جزائر غرب الہند کی سرکاری اور عوامی دونوں سطحوں پر زبان انگریزی ہی ہے۔ چنانچہ جناب عمران این حسین انگریزی میں تحریر اور تقریر دونوں میں یکساں مہارت اور یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ اور اس وقت امریکہ کے طول و عرض کے علاوہ بہت سے دوسرے ممالک میں بھی انہیں تقاریر و خطابات کے لیے بلایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ ان کا کرم ہے کہ میری دعوت پر تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع کے موقع پر منعقد ہونے والی ''خلافت کانفرنس'' میں شرکت فرمانے کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔

کراچی کی ایک ملاقات میں جناب عمران این حسین صاحب نے مجھے اپنے اس مقالے

کی نقل عطا فرمائی تھی جو انہوں نے اپنی ڈاکٹریٹ کی تکمیل کے لیے (۱۹۲۴ء میں تنسیخ خلافت کے بعد سے ۱۹۶۵ء میں رباط میں منعقدہ عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس جس کے نتیجے میں "ORGANISATION OF ISLAMIC CONFERENCE" قائم ہوئی) "FROM ISTANBUL TO RABAT" کے عنوان سے تحریر فرمایا تھا۔

اب جبکہ ہم نے پاکستان میں قیام خلافت کے لیے عوامی تحریک چلانے کا فیصلہ کیا ہے تو عوامی دلچسپی اور معلومات کے لیے میں نے جناب عمران این حسین کی اجازت سے اس مقالے کی تلخیص کا اردو ترجمہ ''ندائے خلافت'' میں بالاقساط شائع کر دیا اور اب یہ ''خلافت کانفرنس راولپنڈی'' کے موقع پر کتابی صورت میں ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے۔

امید ہے کہ بفضلہٖ تعالیٰ عمران صاحب کے پاکستان تشریف لانے کا ارادہ ضرور پورا ہوگا اور اس موقع پر شائقین اس کتاب پر مصنف کا آٹوگراف بھی لے سکیں گے۔

خاکسار **اسرار احمد** عفی عنہ
امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان
یکم اکتوبر ۱۹۹۶ء

باب اول

خلافت‘ حجاز اور سعودی قومی ریاست

اُمت کی چودہ صدیوں کی تاریخ میں کوئی ایک بھی حکمران ایسا نہیں گزرا جس نے خلافت کا دعویٰ کیا ہو اور اس پر اُمت کا اجماع ہو گیا ہو لیکن حجاز‘ بالخصوص حرمین (مکہ‘ مدینہ) پر اس کا کنٹرول نہ ہو۔ اُمت کے نزدیک خلیفہ کا منصب اور حرمین پر اقتدار ہمیشہ سے یکجا تصور کیا جاتا رہا ہے۔ اس کی ایک شرعی حیثیت بھی ہے۔ چونکہ حج کی ادائیگی ہر صاحب استطاعت مسلمان پر لازم ہے‘ جس کے لیے حجاز کا سفر ناگزیر ہوتا ہے‘ اس لیے یہ ممکن نہیں کہ مسلمانوں کے حکمرانِ اعلیٰ کے پاس حج کے انتظامات کا اختیار نہ ہو اور ان انتظامات کے ضمن میں حجاز پر اس کا کنٹرول نہ ہو۔ چنانچہ اُس وقت بھی جب دارالخلافہ حجاز سے کوفہ (عراق)‘ دمشق‘ بغداد‘ قاہرہ‘ یہاں تک کہ استنبول منتقل ہوتا چلا گیا‘ جو بھی خلیفہ کا عہدہ سنبھالتا‘ حجاز پر اپنا اقتدار قائم کرنے پر خصوصی توجہ مرکوز کرتا۔ چنانچہ یہ سلسلہ بغیر کسی رکاوٹ کے پہلی جنگ عظیم میں خلافت عثمانیہ کے خاتمے تک قائم رہا۔

اسلام پر مغربی تہذیب کے غلبے اور عالم اسلام میں سیکولر نظام قائم کرنے کے لیے حجاز پر مغرب کا تسلط ضروری تھا تاکہ خلافت کو کمزور کر کے بالآخر بالکل ختم کر دیا جائے۔ ورنہ جب تک خلافت موجود رہے گی‘ اُسے مسلمانوں کے مرکز اور یکجہتی کی حیثیت حاصل رہے گی۔ چنانچہ برطانیہ نے پہلی جنگ عظیم کے دوران سب سے پہلا کام یہ کیا کہ عثمانیوں کے مقرر کردہ شریف مکہ‘ شریف حسین سے بغاوت کرا کر حجاز پر اس کی حکومت قائم کروادی۔ ۱۹۱۶ء تک زیریں حجاز یعنی مکہ اور جدہ عثمانیوں کے ہاتھ سے جا چکا تھا‘ تاہم جنگ کے عرصے میں مدینہ پر سلطنت عثمانیہ کا کنٹرول باقی رہا۔ ۱۹۱۹ء میں بعض عثمانی سپاہیوں نے اپنے جان باز لیڈر‘ فخری پاشا کے خلاف بغاوت کر کے گویا قصہ ہی تمام کر دیا۔

ادھر ۱۹۱۹ء میں جنرل ایلن بی کی سرکردگی میں برطانوی فوجوں نے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ یہ بات خاص طور پر نوٹ کرنے کی ہے کہ ایلن بی نے اس مقدس شہر میں داخل ہوتے وقت بڑے فخر سے اعلان کیا کہ ”صلیبی جنگوں کا اب ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا“۔ جزیرہ نمائے عرب میں

برطانوی سازشوں سے اسلام کو درپیش خطرے کے بارے میں اگر کسی کے دل میں کوئی شبہ تھا بھی تو ایلن بی کے اس اعلان سے وہ دور ہو جانا چاہیے تھا۔ بہرحال حجاز کے ہاتھ سے نکل جانے کے چند سال بعد سلطنت عثمانیہ کا بھی خاتمہ ہو گیا' جو بلاشبہ برطانیہ کی حکمت عملی کی ایک شاندار کامیابی تھی۔ ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو جب بالآخر خلافت عثمانیہ کی مکمل طور پر بساط لپیٹ دی گئی تو رہی سہی امیدوں پر بھی پانی پھر گیا۔

۷ مارچ ۱۹۲۴ء کو شریف حسین نے بڑی مستعدی سے اپنے خلیفہ ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ اس کے پاس سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ حجاز پر بالفعل اس کا کنٹرول تھا۔ مزید برآں اس نے ہاشمی ہونے کی بھی شیخی بگھاری' یعنی اپنا تعلق قریش کے بنو ہاشم قبیلے سے' جس سے کہ خود نبی اکرم ﷺ تھے' جتلایا۔ علماء ان کے اس فریب سے اس درجے متاثر ہوئے کہ ماورائے اُردن کے چیف قاضی نے ان کے اس دعویٰ پر صاد کرتے ہوئے انہیں فوراً خلیفہ تسلیم کر لیا۔ ان کی ایک اور خوبی' جو اگرچہ مسلم عوام کے نزدیک غیر معتبر تھی مگر خطے میں سیاسی جوڑ توڑ کے لحاظ سے اس کی بڑی اہمیت تھی' یہ تھی کہ ان کی پشت پر اس وقت کی عظیم طاقت' برطانیہ تھا' جس نے عثمانی تسلط کے خلاف بغاوت اور حجاز پر قبضہ کرنے میں ان کی مالی' سفارتی اور فوجی امداد کی تھی۔ ادھر جزیرۃ العرب کے بارے میں برطانوی پالیسی مختلف مقاصد لیے بڑی جامعیت کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ سب سے پہلے اس کے پیشِ نظر حرمین کو خلیفہ کے کنٹرول سے آزاد کرانا تھا تاکہ مسلمانوں کی مرکزیت باقی نہ رہے' ساتھ ہی حجاز میں ایک حلیف حکومت کا قیام ضروری تھا تاکہ آئندہ بھی سیاسی جوڑ توڑ کا موقع فراہم رہے اور ان سب پر مستزاد فلسطین میں ایک یہودی ریاست کا قیام تھا جس کا پیش خیمہ ۱۹۱۶ء کا ''سائیکس۔ پکاٹ'' (Sykes-Pikot) معاہدہ اور ۱۹۱۷ء کا اعلان بالفور تھا۔

مسلمانوں کی مرکزیت ختم کرنے میں پورا مغرب یکجا تھا جس کے دباؤ میں آ کر اس سے قبل سلطنت عثمانیہ کو ذمہ اور جزیہ ختم کر دینا پڑا تھا۔ برطانیہ اور صیہونیت کے علم میں تھا کہ فلسطین میں قائم ہونے والی اسرائیل کی یہودی ریاست اس وقت تک مسلسل خطرے سے دوچار رہے گی جب تک مسلمانوں کے لیے ایک خلیفہ موجود ہے۔ اس لیے برطانیہ کے لیے شریف حسین کی خلافت میں بھی اندیشے کا پہلو تھا' کیونکہ آگے چل کر یہ سلسلہ جڑ پکڑ سکتا تھا' چنانچہ برطانیہ نے شریف حسین سے کام نکال لینے کے بعد عبدالعزیز ابن سعود کی پیٹھ ٹھونکی اور اسے شریف حسین کے

مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ دورانِ جنگ ہی اس مقصد کے لیے برطانیہ نے ابن سعود کے ساتھ ساز باز کر رکھی تھی اور پانچ ہزار پونڈ ماہانہ کے عوض اُسے رام کر لیا تھا۔ نجد میں سعودی طاقت اس اتحاد کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی جو وہابی فرقے کے راہنما اور سعودی قبیلے کے سربراہ کے درمیان قائم ہوا تھا۔ اس کی رو سے حکمرانی کا حق سعود خاندان کو دیا گیا اور مذہبی معاملات میں وہابی فرقے کی عمل داری تسلیم کی گئی تھی۔ ۱۹۰۲ء میں ریاض پر قبضے کے بعد یہ اتحادی طاقت نمایاں طور پر سامنے آئی۔

خلافت پر ہاشمیوں کے دعویٰ کے چار روز بعد ابن سعود نے شریف حسین کے خلاف فوجی کارروائی شروع کر دی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس وقت یروشلم پر یہودی قبضے اور حجاز پر وہابی قبضے، دونوں کے لیے خلافت کا قیام خطرے کا باعث تصور کیا جا رہا تھا، مگر برطانیہ اس بارے میں مطمئن تھا کہ حجاز میں سعودی وہابی حکمرانوں کے ہوتے ہوئے خلافت کا بحال ہونا ممکن نہیں رہے گا، کیونکہ وہابی خلیفہ باقی دنیا کے مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوگا۔ بہرحال برطانیہ کی پشت پناہی حاصل ہونے پر چند ماہ کے اندر ابن سعود نے مکہ فتح کر کے شریف کو جدہ بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ بالآخر برطانیہ نے شریف کو قبرص میں پناہ دے کر جدہ اور مدینہ کو سعودیوں کے حوالے کر دیا۔ گزشتہ ایک صدی سے زائد عرصے میں سعودی، وہابی اتحاد زبردست خونریزی کے بعد مکہ اور طائف پر پوری طرح قابض ہو چکا تھا۔ انہوں نے حجاز میں رہنے والے عام مسلمانوں کو مشرکین مکہ پر محمول کرتے ہوئے بے دریغ قتل کرنا شروع کیا، جس پر استنبول میں مقیم خلیفہ نے مصر کے مملوک خدیو محمد علی سے کہا کہ وہ اپنے بیٹے اسمٰعیل کو فوج دے کر حجاز بھیجے۔ اس نے سعودی، وہابی جنگجوؤں کو حجاز سے نکال کر صحرا کی طرف دھکیل دیا، لیکن ایک صدی بعد جب خلافت ہی باقی نہ رہی اور مسلمانوں کے تمام طاقتور علاقے سامراج کے شکنجے میں جکڑے گئے تو حرمین اور حجاز پر سعودی تسلط ختم کرانا کسی کے بس میں نہ رہا، خصوصاً جب اسے برطانیہ عظمیٰ جیسی طاقت کی پشت پناہی حاصل تھی۔

اگرچہ حجاز پر ابن سعود کا مکمل کنٹرول تھا لیکن دنیا میں بسنے والے کروڑوں غیر وہابی مسلمانوں کے ساتھ ہم آہنگی اور امت کے اتحاد کا مسئلہ ابھی طے ہونا باقی تھا۔ چنانچہ انہوں نے پوری دنیا کے مسلمانوں کے نام ایک اعلان جاری کیا کہ سرزمین حجاز اور حرمین سب کے لیے

ہے' ابن سعود کی حیثیت امانت دار کی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ مسلمان اپنے نمائندے مکہ بھیجیں تا کہ اس مقصد کے لیے شوریٰ اور اجماع کی بنیاد پر ایک عادل' اہل اور نمائندہ انتظامیہ مقرر کی جائے۔ یہ اعلان اسلام کے تقاضوں کے عین مطابق تھا' ابھی حجاز کی حیثیت نبی ﷺ کے قائم کردہ دارالاسلام کی تھی' لیکن یہ خوبصورت اعلان صرف دکھاوے کے لیے تھا' اصلاً اس کا مقصد الازہر کے اس اقدام کا توڑ کرنا تھا جو خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے نتیجے میں کیا گیا تھا۔ الازہر کی طرف سے تجویز پیش کی گئی تھی کہ قاہرہ میں ایک بین الاقوامی اسلامی خلافت کانفرنس منعقد کی جائے جو دیگر امور کے علاوہ مسلمانوں کے لیے ایک خلیفہ کا تقرر کرے۔ وہابی بڑے زور شور سے اس بات کی تلقین کرتے رہے تھے کہ خلافت راشدہ کے بعد سے صحیح معنوں میں خلافت قائم نہیں رہی' لہٰذا انہیں الازہر کی اس تجویز کا خیر مقدم کرنا چاہیے تھا' لیکن اس کے برعکس انہوں نے موقع پرستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس تجویز کو ناکام بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور قاہرہ کانفرنس کے متبادل کے طور پر ۱۹۲۶ء کے حج کے موقع پر مکہ میں ایک کانفرنس منعقد کرنے کی تیاری شروع کر دی جس کے دائرہ کار سے خلافت کا مسئلہ سرے سے خارج تھا۔ برطانوی حکمت عملی کا یہ شاہکار تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے' جو پورے عالم اسلام میں خلافت کے سب سے زیادہ شیدائی تھے اور خلافت عثمانیہ کے حق میں زبردست تحریک چلا چکے تھے' مئی رجون ۱۹۲۶ء میں قاہرہ کانفرنس کی بجائے جولائی ۱۹۲۶ء کی مکہ کانفرنس میں شرکت کی۔ بہرحال مکہ کانفرنس کامیاب رہی اور عالم اسلام کے مرکز یعنی حجاز میں ایک قومی ریاست کے قیام سے خلافت کا مسئلہ طویل عرصے کے لیے پس پشت چلا گیا۔ مکہ کانفرنس کی کامیابی نے عالم اسلام کے لیے مصطفیٰ کمال پاشا کے نقش قدم پر چلنے اور قومی ریاستیں قائم کرنے کا راستہ ہموار کر دیا۔ ۱۹۲۴ء کے بعد کی تاریخ ان خرابیوں کی گواہ ہے جو اُمت مسلمہ کے جسد میں قومی اور لادینی ریاست کا تصور قبول کر لینے کے باعث پیدا ہوئیں' نیز ان سطحی اور بچگانہ کوششوں سے بھی عبارت ہے جو علمی سطح پر نظام اسلام کی قومی ریاست کے تصور کے حوالے سے تجدید کے لیے کی گئیں۔

علامہ اقبال اور مولانا مودودی' دونوں نے مابعد خلافت دور میں اسلامی نظام سے متعلق اجتہادی کاوش کی' جس کے نتیجے میں ایک ''اسلامی ریاست'' کا تصور ابھرا۔ بدقسمتی سے اسلامی ریاست قائم کرنے کے لیے جو کوششیں کی گئیں ان کے نتیجے میں امت کے سیاسی مرکز کا قیام اور

حقیقی نظام اسلام کا تصور نظروں سے اوجھل ہوتا چلا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارے عالم اسلام کی سیاسی سوچ غلط رُخ پر مڑ گئی جو آج بھی اسی غلط رخ پر جاری ہے۔ چنانچہ خلافت کے بعد کی صورت حال اور موجودہ عالمی تناظر میں نظام اسلام کے تقاضوں کو سمجھنے کے لیے ہمیں قاہرہ' مکہ اور بعد میں منعقد ہونے والی کانفرنسوں کا قدرے تفصیل سے جائزہ لینا ہوگا۔

باب دوم

خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ

پہلی جنگ عظیم

پہلی جنگ عظیم کہنے کو تو یورپ کی جنگ تھی لیکن اس سے عالم اسلام میں جو نشیب و فراز آئے ان کی مثال مسلمانوں کی تیرہ صدیوں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

اولاً: اُس وقت کی عظیم مسلم طاقت اور خلافت پر متمکن، سلطنت عثمانیہ کا جنگ میں مرکزی قوتوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ اگرچہ آج تک ایک متنازعہ امر شمار ہوتا ہے، کیونکہ آخر وقت تک عثمانی قیادت اس مخمصے میں تھی کہ جنگ میں حصہ لیں یا نہ لیں اور کس کا ساتھ دیں کس کا نہ دیں، لیکن گمان یہ ہے کہ اس فیصلے کے پیچھے انگریزوں اور یہودیوں کا ہاتھ تھا۔ یہودی راہنما، جنہیں برطانیہ کی تائید حاصل تھی، اس سے قبل یروشلم کا کنٹرول حاصل کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہے تھے، یہاں تک کہ اسے خریدنے کی کوشش بھی کی گئی، لہٰذا جنگ میں برطانیہ کے پیش نظر ایک اہم مقصد مسلمانوں کو کمزور کر کے فلسطین میں یہودی ریاست قائم کرنا بھی تھا۔ عثمانی قیادت جنگ میں سارے عالم اسلام کو ساتھ لینا چاہتی تھی، چنانچہ سلطنت عثمانیہ کے شیخ الاسلام نے ۲۳ر نومبر ۱۹۱۴ء کو اتحادی طاقتوں کے خلاف لڑنے کا فتویٰ جاری کیا۔ لیکن برطانیہ عرب قومیت کو ہوا دے کر مسلمانوں کی اس عالمگیر قوت میں شگاف ڈالنے میں کامیاب ہوگیا۔ جنگ شروع ہونے کے دو سال کے اندر برطانیہ کی شہ پر شریف حسین نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر کے مسلمانوں کے مرکز، حجاز پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ مکہ اور مدینہ ہاتھ سے نکل جانے سے عثمانی قیادت کو زبردست دھچکا لگا۔ برطانیہ نے اگلا اقدام یہ کیا کہ عراق اور ماورائے اردن کی بادشاہی شریف حسین کے دو بیٹوں کو سونپ دی۔ ۱۹۱۹ء تک برطانوی جرنیل ایلن بی عرب فوجوں کو لے کر لڑتا ہوا یروشلم جا پہنچا۔ لیگ آف نیشنز نے فلسطین پر برطانوی تسلط کی توثیق کر دی۔ ۱۹۴۸ء میں برطانیہ نے فلسطین کو خالی کر کے وہاں اسرائیل کی ریاست قائم کر دی۔

جنگ میں سلطنت عثمانیہ کو بری طرح شکست ہوئی۔ اتحادی اس جنگ میں بڑی چالاکی سے

مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے میں کامیاب رہے۔ برطانیہ اور فرانس نے ہندوستان کے مسلمانوں اور عربوں کو ساتھ ملا کر انہیں ترک مسلمان بھائیوں کے خلاف لڑایا جس سے عالمگیر اسلامی بھائی چارے کی بنیادیں ہل گئیں۔ تاہم مصطفٰی کمال کی سرکردگی میں ترکی کی قومی فوج نے بے جگری سے لڑتے ہوئے اپنے ملک کو یورپی طاقتوں کے قبضے میں جانے سے بچا لیا۔

ترک قوم پرست اور خلافت

ترکی کی نیشنلسٹ قوتیں ۵۰ سال سے سلطان کے خلاف نبرد آزما تھیں جسے وہ شخصی آمریت پر محمول کرتی تھیں' لہٰذا یہ قوتیں دستوری حکم نامے کے ذریعے سلطان کے اختیارات محدود کرانے کے درپے تھیں۔ ترکی کی نیشنلسٹ قوتیں سلطنت عثمانیہ کے مقابلے میں مغربی تہذیب کی برتری کا باعث سیکولرازم کو قرار دیتی تھیں۔ ادھر جب نہ صرف مکہ اور مدینہ ہاتھ سے جاتے رہے بلکہ جنگ میں مسلمانوں نے اپنے ترک بھائیوں پر گولیاں چلائیں تو عالم اسلام کا آپس کا جو رشتہ چلا آرہا تھا وہ خود بخود ٹوٹ گیا جس سے قوم پرست قوتوں کو موقع مل گیا کہ ترکی کی اسلامی حکومت کو ختم کر کے مغربی طرز کی جدید سیکولر قومی ریاست' جمہوریہ ترکی کی داغ بیل ڈالیں جس کا لازمی جزو ہی مذہب اور ریاست میں علیحدگی ہو۔ چنانچہ ترکی کی نئی وجود میں آنے والی گرینڈ نیشنل اسمبلی نے ۱۹۲۲ء میں عبدالمجید کو خلافت کے عہدے پر فائز کر کے گویا انہیں مسلمانوں کے مذہبی امور کا نگران مقرر کر دیا جبکہ دنیاوی معاملات سے انہیں فارغ کر دیا گیا۔

ترکی میں خلافت کا خاتمہ تو ہو گیا لیکن جس طرح یورپ والوں نے سلطنت روما کے خاتمے کے بعد عیسائیت کو بھی خیر باد کہہ دیا تھا اس طرح ترکی سے اسلام کو نکال باہر کرنا کسی کے بس کا روگ نہ اس وقت تھا' نہ آج ہے۔ خلیفہ اور پوپ میں جو فرق ہے اسے دور نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ چونکہ اسلام میں مذہب اور ریاست کی علیحدگی کا کوئی تصور نہیں' لہٰذا سیاست میں سیکولرازم کی پیوند کاری کار عبث ہے۔ خلافت کو جو مقام حاصل ہے سیکولر نظام اس کی گرد کو بھی نہیں پا سکتا۔ اس کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ ترکی میں مصطفٰی کمال کی طاقت کو کمزور کرنے کے لیے انگریزوں کو بالآخر ہندوستان میں تحریک خلافت کا ہی سہارا لینا پڑا۔ اُدھر ترکی کے قوم پرستوں کو بھی بہت جلد اس کا اندازہ ہو گیا کہ اگر جرأت سے کام نہ لیا گیا تو ریاستی امور دوبارہ اسلام کے قبضے میں چلے جائیں گے۔ لہٰذا توقع کے عین مطابق ترکی کی گرینڈ نیشنل اسمبلی نے

۳/مارچ ۱۹۲۴ء کوایک قانون کے مطابق خلافت کی بساط ہی لپیٹ دی۔اس کے لیے جو قانون منظور کیا گیا اس کے الفاظ یہ تھے:

''خلیفہ کو معزول کیا جاتا ہے' خلافت کا منصب منسوخ کر دیا گیا ہے' اس لیے کہ خلافت کے معنی حکومت اور جمہوریت ہی ہیں۔''

اُمت کی تاریخ میں اس قانون کا منظور کیا جانا ایک فیصلہ کُن موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمان خلیفہ سے کلیتاً محروم ہو گئے تھے' ورنہ بد سے بدتر حالات میں بھی خلافت کا ادارہ موجود رہا تھا۔اور اب گویا یہ بات حتمی ہے کہ عالم اسلام خلافت کے بعد کے دور میں سانس لے رہا ہے۔

خلافت کا خاتمہ اور الازہر کا اقدام

خلافت کے خاتمے اور اس کی جگہ مغربی طرز کی سیکولر قومی ریاست کے قیام سے جو اہم تبدیلی عمل میں آ رہی تھی' علامہ اقبال جیسے عظیم مفکر بھی غالباً پوری طرح اسے سمجھنے سے قاصر رہے تھے۔اس لیے کہ خلافت اسلام کا جزو لازم ہے اور خلافت کا خاتمہ اسلام کے ایک بہت بڑے حصے سے گویا دستبرداری تھی' لہٰذا اس کا مقابلہ اس پیمانے پر کیا جانا چاہیے تھا جس پیمانے پر تبدیلی واقع ہو رہی تھی۔ بہرحال ترکی کی اسمبلی میں اس قانون کی منظوری کے ۲۲ روز بعد قاہرہ میں الازہر یونیورسٹی کے ریکٹر نے یونیورسٹی اور دیگر اہم مصری علماء سے ملاقات کر کے خلافت کے مسئلے پر یہ اعلامیہ جاری کیا:

''خلافت' جو امامت کے ہم معنی ہے' دینی اور دنیاوی معاملات میں تمام مسلمانوں کا مسئلہ ہے' کیونکہ یہ پوری ملت کے مفادات کی نگہداشت اور امت کے معاملات کو چلانے کی ضامن ہوتی ہے۔''

امام کی توضیح کے بارے میں علماء کا کہنا تھا کہ اس سے مراد:

''......وہ نائب ہے جس کے ذمے مذہبی قوانین کی نشر و اشاعت' ان کا نفاذ اور دنیاوی معاملات کو شریعت کے مطابق چلانا ہوتا ہے۔''

''اہل حل وعقد کی طرف سے بیعت کے نتیجے میں یا بصورت دیگر اپنے پیشرو کی جانب سے بطور جانشین نامزدگی کے ذریعے امام کا تقرر عمل میں لایا جاتا ہے۔''

''اگر صورت حال ایسی ہو کہ کوئی فریق ناجائز طور پر خلافت پر قابض ہو جائے تو طاقت

کے ذریعے بھی یہ منصب حاصل کیا جا سکتا ہے اور اس منصب کو مزید تقویت دینے کے لیے پہلے خلیفہ کو فتح حاصل کرنے والے شخص کی بیعت کرنے کا موقع دیا جا سکتا ہے۔ ماضی میں بیشتر خلفاء کا معاملہ اسی طرح کا رہا ہے۔''

بہر حال مصر کے علماء نے ترکی کی گرینڈ نیشنل اسمبلی کی طرف سے خلافت کے منصب پر عبدالمجید کے ایسے تقرر کو، جس میں سیاسی اختیارات خلیفہ کی بجائے نیشنل اسمبلی کے پاس ہوں اور پہلے سے موجود خلافت کو ختم کر دیا گیا ہو، اس بنا پر بدعت قرار دیا اور اس کی مذمت کی کہ اسلام میں اس سے پہلے ایسی کوئی مثال موجود نہ تھی۔ مزید برآں ان علماء نے ایک اسلامی کانگریس بلانے کا فیصلہ کیا تاکہ اس میں تمام مسلمانوں کے نمائندے آ کر نئے خلیفہ کے تقرر کے بارے میں غور کریں۔ خلافت عثمانیہ کے خاتمے پر دنیا کے مسلمانوں کا یہ پہلا سنجیدہ ردِ عمل تھا، لیکن اس میں جو تجویز سامنے لائی گئی تھی اپنی جگہ وہ خود اسلام کے روایتی طرز عمل سے مطابقت نہیں رکھتی تھی، بلکہ اسے بھی بدعت قرار دینا بے جا نہ ہوگا۔

الازہر کے علماء تمام دنیا کے مسلمانوں کے نمائندوں کی کانگریس کے ذریعے نئے خلیفہ کے انتخاب کی تجویز دے رہے تھے جبکہ پہلی صدی کے نصف اول کے بعد سے لے کر اسلام کی پوری تاریخ میں کبھی بھی عوام نے خلیفہ کا انتخاب نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس پوری تاریخ میں مسلمان عوام کی کسی اسمبلی یا کانگریس نے خلیفہ منتخب کیا تھا۔ چنانچہ یہ تجویز پہلے ہی مرحلے میں مشکلات کا شکار ہو گئی۔ جس کمیٹی کو کانگریس کے انعقاد کی ذمہ داری سونپی گئی تھی وہ اصل مسئلے کو چھوڑ کر نئے خلیفہ کے انتخاب کے مسئلے میں الجھ کر رہ گئی۔ البتہ ایک بہت اہم بات یہ سامنے آئی کہ اسلام کی پوری تاریخ میں پہلی مرتبہ جید علماء کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی کہ اُمت کو درپیش اہم مسائل پر مسلمانوں کی ایک نمائندہ اسمبلی یا کانگریس میں بحث کی جا سکتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک مجوزہ کانگریس میں شوریٰ اور اجماع کے ذریعے فیصلہ کرنے کا تعلق ہے، تو مسلمانوں کی خلافت راشدہ کے بعد کی تاریخ کی نسبت یہ طریقہ کار حقیقی اسلام سے قریب تر ہوتا۔

باب سوم

خلافت کانفرنس قاہرہ (مئی ۱۹۲۶ء)

ایجنڈا

مئی ۱۹۲۶ء میں قاہرہ میں ہونے والی کانفرنس میں مندرجہ ذیل امور پر غور کیا گیا:

۱) خلافت کی تشریح اور خلیفہ کے مطلوبہ اوصاف

۲) کیا اسلام میں خلافت ضروری ہے؟

۳) خلافت کے انعقاد کا طریقہ کار؟

۴) کیا اس وقت ایسی خلافت قائم کی جا سکتی ہے جو شریعت کے تمام تقاضے پورے کرے؟

۵) اگر نہیں تو کیا اقدام ہونا چاہیے؟

۶) اگر کانگریس خلیفہ مقرر کرنے کا فیصلہ کرے تو اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کیا کرنا ہوگا؟

وفود

کانگریس میں شرکت کے لیے مصر' لیبیا' تیونس' مراکو' جنوبی افریقہ' ڈچ' ایسٹ انڈیز (اب انڈونیشیا)' یمن' حجاز (اب سعودی عرب)' فلسطین' عراق اور پولینڈ سے وفد آئے۔ بہت سے اہم اسلامی ممالک اور دیگر مسلمانوں کے نمائندوں کی عدم شمولیت نمایاں طور پر محسوس کی گئی' مثلاً ترکی' فارس (اب ایران)' افغانستان' نجد (جو اب سعودی عرب میں شامل ہے) اور روس' چین اور ہندوستان سے مسلمانوں کے نمائندے۔

ترکی نے معذرت کرتے ہوئے کورا جواب دے دیا کہ ہمیں خلافت کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں۔ فارس کو' جو ایک شیعہ ملک تھا' سُنی خلیفہ سے ویسے ہی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ روس' چین اور ہندوستان کے مسلمانوں نے' جن کی حیثیت غیر مسلم ممالک میں اقلیتوں کی تھی' مشترک رویہ اپنایا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ محض ایک علمی نوعیت کا اجتماع ہے' نہ تو کسی کے پاس کوئی اختیار ہے اور نہ ہی ان سے انہیں کوئی قابل ذکر مدد اور تحفظ حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کی شرکت کی اصل وجہ یہ تھی

کہ قاہرہ کانفرنس کے مقابلے میں عبدالعزیز ابن سعود نے بھی ایک کانفرنس طلب کی تھی۔ شاہ سعود خود خلافت کے دوبارہ قائم ہونے سے خوفزدہ تھے' کیونکہ ان کے پیش نظر مکہ اور مدینہ کے مقدس شہروں پر اقتدار کا مقصد اپنے خاندان کی بادشاہت قائم کرنا تھا۔

بہر حال قاہرہ میں جو نمائندے جمع ہوئے انہوں نے سنوسی سلسلے کے سید ادریس سنوسی کو برکہ اور ترپولی کا امیر نامزد کر لیا' اس لیے کہ کانفرنس کے شرکاء کو یہ تاثر دلایا گیا کہ ان کے خلیفہ منتخب ہونے کے بہت زیادہ امکانات ہوں گے۔ کانفرنس کے ۱۳، ۱۵، ۱۸ اور ۱۹ مئی ۱۹۲۶ء کو کل چار اجلاس ہوئے۔ پہلے روز کے اجلاس میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس کا کام مختلف تجاویز کا جائزہ لے کر انہیں کانگریس کے سامنے پیش کرنا تھا' چنانچہ کمیٹی نے فوراً ہی یہ تجویز سامنے رکھی کہ کانگریس کی کارروائی راز میں رکھی جائے' مگر یہ تجویز چوتھے اجلاس عام میں رد کر دی گئی' جس کا فائدہ یہ ہوا کہ اس کا سارا ریکارڈ آج حرف بحرف ہمیں دستیاب ہے۔ دوسری اور تیسری کمیٹی کا تقرر دوسرے عام اجلاس میں کیا گیا۔ دوسری کمیٹی کے ذمے ایجنڈے کی شق نمبر ۱، ۲، ۳ اور تیسری کمیٹی کے ذمے شق نمبر ۴، ۵، ۶ کا جائزہ لینا تھا۔ چنانچہ کانگریس کی ساری کارروائی انہی دو کمیٹیوں کی رپورٹوں اور ان پر بحث مباحثہ اور ان کے بارے میں فیصلوں پر مشتمل ہے۔ لہٰذا اب ہم ان رپورٹوں کے تجزیے کی جانب آتے ہیں۔

کمیٹی نمبر ۲

خلافت کی تشریح کے ضمن میں کمیٹی نے الماوردی' ابن خلدون اور ایسے ہی دوسرے علماء کی تحریروں کو بنیاد بنایا۔ انہوں نے اس بات پر خاص طور پر زور دیا کہ خلیفہ کا اقتدار دنیاوی اور مذہبی دونوں شعبوں پر ہونا لازم ہے۔ دوسری بات انہوں نے یہ کہی کہ ایک وقت میں ایک ہی خلیفہ ہونا ضروری ہے' کیونکہ دوسرے مقاصد کے ساتھ ساتھ خلافت کا ایک مقصد وحدتِ اُمت بھی ہے۔

کمیٹی کے سامنے دوسرا سوال (کیا اسلام اور خلافت لازم و ملزوم ہیں؟) بہت حد تک غیر معمولی نوعیت کا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے لے کر اس وقت تک اسلام کی پوری تاریخ میں سنی مسلمانوں کے نزدیک خلافت کو بہت مرکزی اہمیت حاصل رہی تھی' یہی نہیں بلکہ اس دوران میں مسلمانوں نے کبھی یہ سوچا تک نہ تھا کہ خلافت کے علاوہ بھی کوئی صورت حال پیش آ سکتی ہے' لہٰذا کسی مسلمان کا یہ رائے دینا کہ خلافت کا کوئی متبادل بھی ہو سکتا ہے' اپنے آپ کو بدعتی شمار کرانا تھا۔

لیکن دوسری طرف احوالِ واقعی کے اعتبار سے ایک شخص، ترکی کے مصطفی کمال نے بیک جنبش قلم خلافت کو ختم کر کے مسلمانوں کو ایسی صورت حال سے دو چار کر دیا تھا کہ فی الواقع خلافت کا وجود دنیا میں باقی نہ رہا تھا۔ یہ تھے وہ حالات جن کی موجودگی میں کانگریس کو اس سوال پر غور کرنا تھا کہ کیا خلافت اور اسلام لازم و ملزوم ہیں؟ غالباً اس سے زیادہ اہم سوال مسلمانوں کی پوری تاریخ میں سامنے نہیں آیا تھا جس کا جواب امت کے زعماء کو دینا پڑا ہو۔ چنانچہ کمیٹی کے پاس سوائے اس کے اور کوئی جواب نہ تھا کہ خلافت کے بغیر اسلام کا کوئی تصور نہیں، لیکن اسلام کا یہ ایک ایسا جزو ہے جسے عین اس موقع پر اور اسی وقت عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ بالفاظِ دیگر یہ ایک دینی فریضہ ہے جو کم از کم اس وقت مسلمان ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ لیکن یہ اس سوال کا کوئی مناسب جواب نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ جو ہر شے کا جاننے والا ہے، اپنے بندوں کے سپرد ایسی ذمہ داری کیوں کرے گا جو پوری کرنا ان کے بس میں نہ ہو!

یا تو یہ کہیں کہ اسلام کی رو سے خلافت کا وجود لازم نہیں ہے، اور یا پھر یہ کہ ہے تو لازم مگر ہم سے یہ قائم نہیں ہو سکی، جس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام مسلمان گناہ گار ہیں اور آخرت میں سزا کے مستوجب ہوں گے۔

تیسرے سوال (خلافت قائم کیسے ہو؟) کا جواب کمیٹی نے یہ دیا:

...... خلیفہ وقت کی جانب سے جانشین کی نامزدگی کے ذریعے

...... بارسوخ مسلمانوں کی طرف سے تقرر کے ذریعے۔ یعنی ایسے اشخاص جنہیں عوام مانتے ہوں، مثلاً علماء، امراء اور دوسرے ممتاز صائب الرائے اشخاص باہم مشورے سے خلیفہ کا تقرر کر سکتے ہیں۔

...... ایک مسلمان فاتح کی حیثیت سے خلیفہ کے منصب پر فائز ہو سکتا ہے، خواہ وہ دوسری شرائط پوری نہ کرتا ہو۔

کمیٹی نمبر ۲ کی اس رپورٹ پر عراقی وفد کے ایک رکن، تیونسی پروفیسر عبدالعزیز آفندی اور مصر کے وفد کے سربراہ شیخ محمد الاحمدی الظواہری کے درمیان ایک نہایت اہم اور دلچسپ بحث چھڑ گئی جس کا موضوع تھا: اسلام کے نظریاتی اصول اور اجتہاد کی ضرورت۔

آفندی: ''اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ خلافت کے مسئلے کا حل انتہائی اہم ہی نہیں

مشکل بھی ہے' اس لیے میری تجویز یہ ہے کہ کانگریس کو اگلے سال تک ملتوی کر دیا جائے' تا کہ ہم اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لے سکیں۔ محض نظری اعتبار سے مسئلے کا حل تلاش کرنے سے بات نہیں بنے گی' موجودہ حالات اور خاص طور پر اسلامی اداروں پر بیرونی اثرات کو بھی ایک حد تک پیش نظر رکھنا پڑے گا۔''

شیخ الظواہری: ''ہمارے سامنے جو نظریاتی سوالات آئے ہیں ان کا جائزہ لینے کے وقت ہمیں اجتہاد کا سہارا لے کر کوئی نیا نظریہ سامنے نہیں لانا چاہیے۔ ہمیں اپنے آپ کو اسلام کے مسلمہ اصولوں کا پابند رکھنا چاہیے۔ جہاں تک ان اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کا تعلق ہے تو یہ آپ پر منحصر ہے' آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہمارے بس سے باہر ہے۔''

آفندی: ''میں نہ تو کوئی نیا اصول وضع کرنے کے حق میں ہوں اور نہ ہی اجتہاد کی دلالت کر رہا ہوں' میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ ان اصولوں کی تائید کرتے ہیں جن پر عمل درآمد ہمارے اختیار میں نہیں ہے تو اس کا حاصل کیا ہوگا؟''

شیخ الظواہری: شریعت کے حوالے سے یہ سوال اٹھانا کہ وہ ایک وقت میں قابل عمل ہے اور ایک دوسرے وقت میں قابل عمل نہیں ہے' اسلام کے لیے خطرناک ہے۔ ہمارے نزدیک شریعت کے عام اصولوں کے اطلاق میں کوئی استثناء نہیں ہے اور حالات یا وقت کے تقاضے کچھ بھی ہوں ان اصولوں میں ترمیم یا تجدید کی کوئی گنجائش نہیں۔''

بلاشبہ شیخ الظواہری یہ کہنے میں پوری طرح حق بجانب تھے کہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ قوانین میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جا سکتی' خواہ ظروف واحوال کا تقاضا کچھ بھی ہو شریعت اپنی اصل شکل میں برقرار رہے گی چاہے مسلمانوں کے لیے ایک خاص وقت میں اس پر عمل درآمد کرنا ممکن ہو یا نہ ہو۔ تاہم آفندی کا یہ سوال بہت اہم تھا جس کا کسی کے پاس کوئی جواب نہ تھا' یعنی یہ کہ اگر ہم اس وقت سیاسی سطح پر شریعت نافذ کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے تو اس کے نتائج کیا ہوں گے؟ اصل میں الظواہری اور آفندی دونوں کے نقطۂ نگاہ میں ایک بنیادی خامی تھی۔ وہ قرآن کے اس واضح بیان کی طرف توجہ دینے سے قاصر رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر معاشرے میں دو چیزیں بھیجی ہیں' ایک شریعت اور دوسرے منہاج (ایک کھلا راستہ)۔ چنانچہ ان ابدی قوانین کے علاوہ' جن میں کوئی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی اور جن کی الظواہری کے مطابق پیروی ہم پر ہر حال میں لازم ہے' ایک

منہاج بھی موجود ہے جس میں یہ لچک موجود ہے کہ غیر معمولی ذہانت کے حامل افراد بدلتے ہوئے حالات کے تحت قوانین اخذ کر سکیں۔

بنیادی مسئلہ' جس کی نشاندہی کرنے میں کمیٹی نمبر ۲ اور کانگریس کے ارکان ناکام رہے اور نتیجتاً یہ کانگریس ناکام ثابت ہوئی' خلافت کا روایتی حیثیت سے ہٹ کر نئے سرے سے جائزہ لینے کا تھا۔ نظری طور پر خلافت سے مراد اسلامی نظام قیادت ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو حکم دیتے ہوئے قرآن مجید میں اس کا یوں ذکر آیا ہے:

﴿يَاۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ‌ۚ﴾ (النساء:۵۹)

''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو (اللہ کے) رسول کی اور (اطاعت کرو) ان کی جو تم میں اولوالامر قرار پائیں۔''

یہاں یہ بات خاص طور پر نوٹ کرنے کی ہے کہ قرآن حکیم صیغہ واحد میں کسی ایک شخص کی اطاعت کا حکم نہیں دیتا بلکہ ''ان'' اصحابِ اقتدار کی اطاعت کا حکم دیتا ہے' جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امت میں ایک سے زائد اصحاب اقتدار ہو سکتے ہیں۔ قرآن میں کہیں یہ نہیں آیا کہ پوری امت کی قیادت لازماً ایک ہی شخص کے ہاتھ میں ہو (اور اسے خلیفہ کا ہی نام دیا جائے)' البتہ امت پر سارے مسلمانوں کے لیے اقتدار کسی ایک شخص کے سپرد کرنے پر کوئی پابندی بھی نہیں' لیکن قرآن کی رو سے ایسے سیاسی نظام میں عوام کے اتفاقِ رائے کو بہر حال بنیادی حیثیت حاصل ہوگی۔

نبی ﷺ کی وفات کے بعد اسلام کے ابتدائی دور میں امت کے نزدیک ایک شخص کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار دینا ضروری خیال کیا گیا۔ وحدتِ اسلامی کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ اسی طرح یہ بھی ضروری تھا کہ قیادت قریش کے اندر رہے۔ تاہم یہ سلسلہ صرف ایک صدی تک جاری رہ سکا' جس کے بعد بیک وقت ایک سے زائد حکمران برسر اقتدار رہے اور اُمت کی بقیہ تاریخ میں کبھی واحد قیادت کا دور لوٹ کر نہ آیا۔ البتہ نظریاتی طور پر قرونِ اُولیٰ کے طرز حکمرانی کا تصور اور اس کی تڑپ اُمت کے دل و دماغ میں موجود رہی۔ صدیوں پر محیط یہ تصور اس قدر ذہنوں میں راسخ ہو گیا کہ ایک حکمران اور اس کا قریش میں سے ہونا اسلام کا لازمی تقاضا سمجھ لیا گیا۔ یہاں

تک کہ آج بھی سُنّی علماء اور کٹر مذہبی طبقہ اس پر مُصر نظر آئے گا کہ مسلمانوں کا پورے عالم اسلام میں قریش میں سے ایک خلیفہ ہونا لازم ہے۔ لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ قرآن ایک سے زائد حکمرانوں کی اجازت دیتا ہے اور ان کا قریش میں سے ہونا لازم نہیں ہے۔

کمیٹی نمبر ۲ ان حقائق تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام رہی' جس کا نتیجہ کانگریس کی ناکامی کی صورت میں برآمد ہوا۔ اس کمیٹی کی رپورٹ میں ایک اور نمایاں کمی تھی جو سیاست سے متعلق پرانے اسلامی تصور پر مبنی تھی' یعنی خلیفہ اپنے جانشین کو نامزد کر سکتا ہے یا طاقت سے یہ منصب حاصل کر سکتا ہے' حالانکہ نہ تو قرآن میں اس کا ذکر ہے' نہ سُنّت میں اور نہ ہی خلفاء راشدین کے دور میں اس کی کوئی مثال ملتی ہے۔ اور یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ اسلام کی بیشتر تاریخ مختلف بادشاہتوں کے ادوار سے بھری پڑی ہے (موجودہ دور کی فوجی آمریت کو بھی یار لوگ فاتح حکمران کا نام دینے سے ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے)۔ اسلامی فقہاء کئی نسلوں تک' خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کی خلیفہ اوّل حضرت ابوبکرؓ کی جانب سے نامزدگی کی اصل حقیقت کے بارے میں دھوکہ کھاتے رہے۔ بعض دفعہ تو شک گزرتا ہے کہ سُنّی علماء بادشاہت اور شہنشاہیت کو جواز فراہم کرنے کے لیے اس سے جان بوجھ کر غلط استدلال کرتے رہے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو اس لیے خلیفہ نامزد نہیں کیا تھا کہ اسلام کی رو سے انہیں اس کا اختیار حاصل تھا' بلکہ جن لوگوں کے پاس نیا خلیفہ چننے کا اختیار تھا ان لوگوں نے اپنا حق حضرت ابوبکرؓ کو تفویض کر دیا تھا۔ علماء نے درحقیقت یہ فتویٰ دینے میں بہت دھوکہ کھایا کہ خلیفہ وقت کو اپنا جانشین مقرر کرنے کا بلاتکلف حق حاصل ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسی بنا پر خلافت کے منصب پر متمکن ہونے والے کسی بھی شخص کی تائید کرنے میں نہ کبھی پہلے پس و پیش سے کام لیا نہ اب لیتے ہیں' خواہ وہ بنو امیہ' بنو عباس یا خلافتِ عثمانیہ کا دور ہو یا اب سعودی عرب میں سعودی بادشاہت' اردن میں ہاشمی شاہی خاندان' مراکش میں شریفی خاندان کی حکمرانی یا خلیج کی بادشاہتیں ہوں۔

اس سے بھی آگے علماء نے حضرت ابوبکرؓ' حضرت عمرؓ' حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ رضوان اللہ علیہم کو خلفاء راشدین کا درجہ دے کر یہ تسلیم کر لیا کہ حضرت معاویہؓ اور ان کے بعد کے خلفاء میں کوئی خاص کمی واقع ہو گئی تھی۔ پہلے چاروں خلفاء کے حوالے سے جو بات خاص طور پر اہمیت کی حامل ہے وہ یہ ہے کہ ان کے بارے میں خاندانی بادشاہت یا طاقت کے ذریعے خلافت کے منصب پر

فائز ہونے کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔

۱۹۲۶ء کی علماء کی خلافت کانگریس کی کارروائی سخت مایوس کن ثابت ہوئی۔ ۱۹۲۴ء میں جس عثمانیہ خلافت کے خاتمے کی علماء نے دہائی دی تھی وہ سوائے خاندانی بادشاہت کے کچھ نہ تھی اور ۱۹۲۶ء میں وہ اس غیر اسلامی خاندانی بادشاہت کی جگہ اسلام کے حقیقی نظام حکومت کا ایک نظری خاکہ بھی پیش نہ کر سکے۔ قرآن کی رو سے ایک اسلامی ریاست میں قیادت کی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنے معاملات باہمی مشورے سے طے کرتے ہیں۔ بفحوائے آیت قرآنی:

﴿وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠﴾ (الشوریٰ:۳۸)

''اور ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں۔''

اس آیت کا اصل مدعا و منشا یہ ہے کہ ایک اسلامی معاشرے میں سربراہ کا تقرر' معزولی اور اس کی جگہ نئے سربراہ کا تقرر (جسے امت کے اجتماعی نظام میں چوٹی کی اہمیت حاصل ہے) تمام مسلمانوں کی رائے سے عمل میں آنا چاہیے۔ علماء کرام کا یہ تصور کہ خلیفۂ وقت اپنا جانشین مقرر کر سکتا ہے یا خلافت کا منصب طاقت کے بل پر حاصل کیا جا سکتا ہے' قرآن سے مطابقت نہیں رکھتا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جو حق دیا ہے یہ تصور اس کی نفی پر مبنی ہے۔ البتہ واقعہ یہی ہے کہ تقریباً پوری تاریخ اسلامی میں عام مسلمانوں کو ان کے اس حق سے کلیتاً محروم رکھا گیا۔ جب ایک شخص طاقت کے ذریعے خلیفہ بن جاتا تو بزورِ شمشیر بیعت کی شرط پوری کرالی جاتی' اس لیے کہ اس کی بیعت سے انکار کا مطلب کھلم کھلا اس کے خلاف بغاوت تھا۔

خلافت کے قیام کے طریقۂ کار کے بارے میں کمیٹی نے جو جواب دیا تھا وہ ایک اور پہلو سے بھی ناقص تھا۔ جیسا کہ اس سے پیشتر ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان کے تجویز کردہ دو طریقے' یعنی نامزدگی یا فتح کرنا' قرآن و سنت اور دورِ خلافت راشدہ سے مطابقت نہیں رکھتے۔ کمیٹی نے عوام کی مرضی سے خلیفہ چننے کا جو طریقہ تجویز کیا اس کی بھی کوئی تفصیل نہیں دی گئی تھی کہ اس وقت (۱۹۲۶ء میں) اگر ضرورت متقاضی ہو تو عوام کی رائے معلوم کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔

بہرحال کمیٹی نمبر ۲ نے بڑے غور و فکر کے بعد جو تجاویز مرتب کی تھیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ الازہر کے علماء جدید ریاستی ڈھانچے سے سرے سے نابلد تھے۔ چنانچہ اگر وہ اپنا مجوزہ نظام عالم اسلام پر نافذ کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو مسلمان ایک دفعہ پھر سیاسی اعتبار سے بالفعل

غلامی کی زنجیروں میں جکڑے جاتے۔

کمیٹی نمبر ۳ نے جو سفارشات پیش کیں وہ بدرجہا واضح اور حقیقت پسندانہ تھیں۔ چنانچہ اس کا کہنا تھا کہ:

”آج مسلمان جن حالات سے دوچار ہیں ان کو مدنظر رکھتے ہوئے سردست خلافت کا احیاء بعید از قیاس ہے۔“

اس کا سبب انہوں نے یہ بیان کیا:

”سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ایسا کوئی بااختیار ادارہ موجود نہیں جسے قانوناً بیعت کا اختیار حاصل ہو۔“

اس سے مراد وہ ”اہلِ حل وعقد“ تھے جو نظری طور پر عوام کی طرف سے خلیفہ کے چناؤ کا فریضہ سرانجام دینے کے ذمہ دار ہوتے ہیں، اور جن کا اُس وقت کوئی وجود نہ تھا۔ زیادہ بہتر ہوتا اگر یہ بھی بتا دیا جاتا کہ اصل میں تو یہ پہلے بھی ایک ڈھونگ ہی تھا۔ بہرحال یہ مان لینا بھی بڑی بات تھی کہ ”خلافت صحیح معنوں میں تو صرف اسلام کے ابتدائی دور میں قائم ہوئی تھی۔“

اس کمیٹی کا مزید کہنا تھا کہ کانگریس نے بجا طور پر تمام مسلمانوں کے نمائندوں کو قاہرہ میں جمع کرنے کی کوشش کی تھی تا کہ ایک نیا خلیفہ منتخب کرنے کا کام ان کے سپرد کیے جانے پر غور کیا جا سکے، لیکن کمیٹی کے نزدیک یہ کانگریس تمام مسلمانوں کی نمائندہ نہیں تھی، کیونکہ مسلمانوں کے کئی اہم حصوں سے نمائندے اس میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ کمیٹی کے اس موقف کا مطلب یہ ہے کہ اگر دنیا کے تمام مسلمانوں کی طرف سے نمائندگی ہوتی تو اس کا امکان تھا کہ کانگریس ایک خلیفہ منتخب کر لیتی اور پوری اسلامی تاریخ میں یہ ایک اپنی مثال آپ ہوتی، لیکن کمیٹی نے ان مخصوص حالات میں احیاءِ خلافت سے عدم موافقت کے ضمن میں جو سب سے دلچسپ وجہ بیان کی وہ غالباً یہ تھی کہ:

”اگر خلیفہ منتخب کر بھی لیا گیا تو وہ دارالاسلام کو مؤثر طور پر کنٹرول کرنے کی اپنی بنیادی ذمہ داری پوری نہیں کر سکے گا۔ دارالاسلام کے بیشتر حصے غیروں کے قبضے میں جا چکے تھے اور جو باقی رہ گئے ہیں وہاں بھی یہ عالم ہے کہ ایک قومی کشمکش کے باعث کوئی گروہ کسی دوسرے کی قیادت تسلیم نہیں کرتا، چہ جائیکہ وہاں کسی نظم وضبط کا خیال دل میں لایا جائے!!“

صاف معلوم ہوتا ہے کہ کمیٹی کی نگاہ اس امر کی طرف بالکل نہیں گئی کہ دارالاسلام کا اپنا اصل سیاسی نظام ہی مغربی سیکولر سیاسی تصور کی زد میں آ چکا تھا جس کے نتیجے میں عین ممکن تھا کہ وہ محض ایک قصۂ ماضی بن کر رہ جائے۔

عالم اسلام کے جو خطے غیر ملکی تسلط میں تھے انہیں دارالاسلام کا نام دینا ایک مضحکہ خیز بات تھی۔ غیر ملکی تسلط کے تحت انہیں دارالاسلام میں کیسے شمار کیا جا سکتا تھا۔ اور اگر اس وقت ایک خلیفہ ان علاقوں پر جو بھی آزاد تھے' مؤثر کنٹرول قائم کرنے سے قاصر تھا' تو اسلامی تاریخ کے حوالے سے یہ بھی کون سی نئی بات تھی؟ جس طرح تیرہ صدیوں سے ہوتا چلا آ رہا تھا' اس وقت بھی ہو جاتا۔

اصل میں کمیٹی نمبر ۳ کے واضح کرنے کی بات یہ تھی کہ مکہ اور مدینہ اس وقت سعودی وہابی کنٹرول میں ہیں' لہٰذا جو بھی خلیفہ مقرر ہو گا حرمین اس کے کنٹرول سے باہر ہوں گے اور اس صورت میں خلیفہ کا کوئی تصور ہی باقی نہیں رہ جائے گا۔ ایک ایسے وقت میں جب کوئی خلیفہ نہ تھا' بلکہ خلافت کا ادارہ ہی خطرے میں تھا' جو بھی خلیفہ مقرر ہوتا اس کے لیے حرمین اور حج کا کنٹرول پہلے کی نسبت زیادہ اہم تھا۔ شریف حسین نے اپنی خلافت کا دعویٰ اسی بنیاد پر کیا تھا۔ اب جبکہ خلافت عثمانیہ ختم کر دی گئی تھی' سعودی وہابی طاقت کے لیے' جس کے کنٹرول میں گزشتہ بیس سال سے نجد کا بیشتر حصہ آ چکا تھا' حجاز جو سو برس قبل ان کے ہاتھ سے جاتا رہا تھا' اسے دوبارہ واپس لینے کا یہ اچھا موقع تھا۔ شریف حسین نے خلافت کا دعویٰ کر کے سعودی وہابی طاقت کو مجبور کر دیا کہ وہ مزید انتظار کیے بغیر پوری قوت کے ساتھ فوراً اس کے خلاف میدان میں آئے۔

حرمین پر کنٹرول حاصل کر لینے کے بعد سعودی وہابی طاقت کا تسلیم کیا جانا ایک امر واقعہ تھا۔ نیز یہ بھی کہ اسے خلافت سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور یہی وہ اصل پریشان کن مسئلہ تھا جو کانگریس کو درپیش تھا۔ کمیٹی کو چاہیے تھا کہ واضح طور پر اس مسئلے کی نشاندہی کرتی کہ حرمین پر جب تک وہابی قابض ہیں سارے مسلمانوں کا ایک خلیفہ مقرر نہیں ہو سکتا' تاکہ جزیرہ نمائے عرب میں برطانوی حکمت عملی کا توڑ کرنے کی کوئی تدبیر کی جاتی اور حرمین کا کنٹرول واپس امت کے پاس آتا' مگر کمیٹی نے اس سے اعراض برتا اور اپنی رپورٹ سے یہ تأثر دیا کہ کانگریس اگر خلافت کا مسئلہ طے کر کے نیا خلیفہ منتخب کرنے میں ناکام رہی ہے تو اس سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں' اور یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ:

''کانگریس نے مسئلے کی نشاندہی کر کے اس کا حل تجویز کر دیا ہے اور اس طرح اُمت کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔''

مسئلے کا جو حل تجویز کیا گیا تھا وہ یہ تھا:

''......مسلمان عوام کو چاہیے کہ مختلف مسلم ممالک میں اپنے آپ کو منظم کریں اور متعدد کانگریسوں کا اہتمام کریں، تاوقتیکہ اسلام کے مطابق خلافت کا مسئلہ حل کرنے میں کامیاب نہیں ہو جاتے......''

کانگریس کی قراردادیں

کانگریس کو کمیٹی نمبر ۳ کی اُمید افزاء رپورٹ پر مایوسی ہوئی تھی۔ الظواہری نے تو اس رپورٹ کو ''اسلام کا مرثیہ'' قرار دیا۔ جن شرکاء نے پہلے کانگریس کی کارروائی کو عام لوگوں اور پریس کے لیے کھلا رکھا تھا بعد میں انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ رپورٹ کا ایک حصہ پریس کو جانے سے روک لیا جائے۔ شیخ الظواہری، جو کمیٹی نمبر ۳ کی رپورٹ کی مخالفت میں پیش پیش تھے، ایک نئی قرارداد سامنے لائے جسے کانگریس نے منظور کر لیا۔ اس قرارداد کے ذریعے اس بات کی تائید کی گئی کہ خلافت کا احیاء ممکن العمل ہے، چنانچہ ایک اور کانگریس کا اہتمام کیا جائے جس میں تمام مسلمانوں کو مناسب طور پر نمائندگی دی جائے اور اس میں شریعت کے مطابق خلافت کے قیام کے لیے ضروری تدابیر اختیار کی جائیں۔ مختصراً یہ کہ نئے خلیفہ کا انتخاب وہ کانگریس کرے گی۔

بہرحال اس اُمید افزاء نکتے پر کانگریس اختتام کو پہنچی۔ کمیٹی نمبر ۳ کی خامیاں جسے کانگریس نے نظر انداز کر دیا، پردۂ اخفاء میں پڑی رہیں کیونکہ نئے خلیفہ کے انتخاب کے لیے جو کانگریس منعقد کرنا تجویز کی گئی اس کی کبھی نوبت نہ آئی۔ پورا عالمِ اسلام حقیقت کے اعتبار سے مابعدِ خلافت کے دور میں داخل ہو چکا تھا۔

باب چہارم

ورلڈ مسلم کانگریس مکّہ (جولائی ۱۹۲۶ء)

جولائی ۱۹۲۶ء میں مکہ میں منعقد ہونے والی ورلڈ مسلم کانگریس دراصل جزیرۃ العرب میں خلافت عثمانیہ کے خاتمے سے پیدا ہونے والی صورت حال کا نتیجہ تھی۔ ۱۹۰۲ء میں ریاض پر قبضے کے بعد عبدالعزیز ابن سعود نے نجد پر دوبارہ قبضہ کر کے خاندانِ سعود کا تسلّط قائم کر لیا تھا۔ تاہم وہابی تحریک کی بنیاد پر خاندانِ سعود کی بادشاہت کا جواز پیدا کرنے کے لیے وہابی نجد کی طرف سے حجاز کو چیلنج کرنا ضروری تھا تاکہ عالم اسلام کے قلب پر ''حقیقی اسلام'' (یعنی وہابی تصور) کا غلبہ ہو جائے۔

یہ موقع اُس وقت پیدا ہوا جب عثمانیوں کے مقرر کردہ شریف مکہ، شریف حسین نے پہلی عالمی جنگ کے اتحادیوں کی شہ پر ۱۹۱۶ء میں عثمانی ترکوں سے حجاز کا علاقہ چھین کر ہاشمی خاندان کی حکومت قائم کر دی۔ اس دوران اُس نے وہابیوں کو حج کرنے سے روک دیا، کیونکہ عقائد کے اختلاف کی ظاہری وجہ کے علاوہ اصل میں اسے وہابی نجد کی طرف سے زبردست خطرے کا احساس تھا۔

دورانِ جنگ شریف حسین اور ابن سعود دونوں نے مل کر برطانیہ کا ساتھ دیا تھا۔ چنانچہ جنگ کے دوران ابن سعود کے لیے حجاز پر قبضہ کرنا ممکن نہ تھا، بلکہ جنگ کے خاتمے کے بعد بھی اس نے عقل مندی سے کام لیتے ہوئے انتظار کرنا مناسب سمجھا، تاکہ یہ دیکھا جائے کہ استنبول میں مقیم خلیفہ کی طرف سے حجاز کا کنٹرول واپس لینے کے لیے کیا اقدامات سامنے آتے ہیں۔ لیکن جب خلافت ہی کا خاتمہ ہو گیا تو اسے شریف حسین کے خلاف چڑھائی کا موقع مل گیا۔ شریف حسین اس سے بے خبر نہیں تھا، تاہم ابن سعود کے خلاف دنیا کے مسلمانوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش میں ۷ رمارچ ۱۹۲۴ کو (خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے چار روز بعد) اس کا خود اپنے آپ کو خلافت کے منصب پر فائز کر لینا کسی کام نہ آ سکا۔

اسلام کی تاریخ میں ۱۹۲۴ء کا سال نہایت اہم ثابت ہوا۔ شریف حسین نے خلیفہ ہونے کا

اعلان کیا جس کا جواب اسے حجاز پر ابن سعود کے حملے کی صورت میں ملا۔ ابن سعود کی نجدی فوج نے ۵ ر ستمبر کو طائف' ۱۳ ر اکتوبر کو مکہ اور ۵/دسمبر ۱۹۲۴ء کو مدینہ فتح کر لیا۔ ۱۹ ر دسمبر ۱۹۲۵ء کو جدہ فتح ہو گیا اور بد قسمت ''خلیفہ'' اور ''عرب کا بادشاہ'' جلاوطن ہونے پر مجبور ہو گیا۔ توقع کے مطابق مکہ کے سرداروں نے ابن سعود کی حجاز پر بادشاہت تسلیم کر لینے میں ہی عافیت سمجھی۔

جزیرۃ العرب نے' جو سعودی وہابی حکمرانی کے تحت متحد ہو چکا تھا' اُمت مسلمہ کی قیادت کا دعویٰ جتانے میں دیر نہ کی' مگر اس مقصد کے لیے خلافت سے ہٹ کر مسلمانوں کی خود مختار قومی ریاستوں کو بنیاد بنا کر ''بین الاقوامی'' اِسلامی اتحاد کا راستہ اختیار کیا گیا۔ سعودی وہابی حکمرانوں کو پوری طرح علم تھا کہ عالم اسلام وہابی قیادت قبول کرنے پر تیار نہیں ہو گا' لٰہذا سعودی وہابی خلافت ناممکن تھی۔ ساتھ ہی اگر دنیا کے مسلمانوں نے مل کر اپنا ایک خلیفہ مقرر کر لیا تو یہ بات حجاز پر سعودی وہابی حکومت کے لیے زبردست خطرے کا باعث ہو گی۔ ایک صدی قبل جس طرح مصر سے بھیجی گئی فوج نے وہابیوں کو حجاز سے نکال باہر کیا تھا ویسا تباہ کن واقعہ دوبارہ پیش آ سکتا تھا۔

مئی ۱۹۲۶ء میں قاہرہ میں منعقد ہونے والی خلافت کانفرنس کے خطرے کے پیش نظر سعودیوں نے خلافت کا متبادل تلاش کرنا شروع کیا' جو اسلامی قومی ریاستوں کے درمیان بین الاقوامی اتحاد کی شکل میں سامنے آیا۔ اس تصور کی بنیاد ترکی میں مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں پہلے ہی پڑ چکی تھی جب اُس نے خلافت کی جگہ جمہوریہ ترکی قائم کیا تھا۔ سعودیوں کو اس سے غرض نہیں تھی کہ قومی ریاستوں کا نظریہ اسلام کے نظامِ حکومت و سیاست کے سراسر منافی ہے۔ انہوں نے صرف یہ دیکھا کہ اس نظام سے حجاز پر ان کی حکمرانی کو دوام حاصل ہوتا ہے۔

چنانچہ سعودی وہابی حکمت عملی کے تحت مئی ۱۹۲۶ء کی قاہرہ خلافت کانفرنس کے مقابلے میں ایک اور کانفرنس کا اہتمام کیا گیا۔ اس کانفرنس کو مؤتمر عالم اسلامی (ورلڈ مسلم کانگریس) کا نام دیا گیا اور یہ جولائی ۱۹۲۶ء میں حج کے موقع پر مکہ میں منعقد ہوئی۔ اس کا مقصد اسلام کے حقیقی نظام حکومت کو ایک طرف رکھتے ہوئے نئے قومی اسلامی ریاستی نظام کو پروان چڑھانا تھا تاکہ سعودی وہابیوں کو اس نئے بین الاقوامی اسلامی ڈھانچے میں حجاز پر حکمرانی کا جواز مل جائے۔

کانگریس کی تیاری کے مراحل کو دیکھتے ہوئے پتہ چلتا ہے کہ سعودی راہنما نے بڑی ہوشیاری سے مدعوین کے سامنے اپنے آپ کو اسلام کے علم بردار کے طور پر پیش کیا اور جزیرۃ

العرب میں حقیقی اسلام کے نفاذ کا وعدہ کیا۔ وہابیوں کو خوب معلوم تھا کہ اسلامی دنیا وہابی خلافت کو تسلیم نہیں کرے گی۔ مگر اس سے بہت پہلے خود عبدالوہاب بھی امام ابن تیمیہ ﷫ کی آراء سے متاثر ہو چکے تھے اور ان کے نزدیک حقیقی خلافت چونکہ قائم نہیں ہوئی تھی اس لیے اس سے امت کے اندر تفرقہ پیدا ہوا' لہٰذا خلافت امت کے اتحاد کی علامت اور بنیاد نہیں بن سکتی' یہ کام شریعت سے لیا جانا چاہیے۔ چنانچہ وہابیوں کے زیر تسلط نجد اور حجاز کا قاہرہ خلافت کانفرنس سے لاتعلق رہنا قدرتی امر تھا اور یہ بات قرین از قیاس تھی کہ خلافت عثمانیہ کے خاتمے اور شریف حسین کی چند روزہ ''خلافت'' کی شکست کے بعد عالم اسلام کے قلب پر سعودی وہابیوں کا تسلط انہیں اُمت کو ایک نئی راہ پر ڈالنے کا سنہری موقع فراہم کر دے گا۔

ابن سعود نے ورلڈ مسلم کانگریس کے لیے قاہرہ خلافت کانفرنس کے ٹھیک ایک ماہ بعد جون ۱۹۲۶ء کی تاریخ طے کر کے یہ واضح کر دیا تھا کہ یہ کانگریس خلافت کانفرنس کے مقابلے میں منعقد ہو رہی ہے۔ مکہ میں ورلڈ مسلم کانگریس منعقد کرنے کے فیصلے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ ابن سعود کی خواہش تھی کہ ارضِ مقدس پر وہابیوں کے تسلط کو بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کی قبولیت حاصل ہو جائے۔ دنیا کے دیگر مسلمانوں سے مذہبی اختلافات کے پیش نظر وہابیوں کے نزدیک اس کی خاص اہمیت تھی۔ وہابی حنبلی مسلک کے پیروکار تھے جبکہ باقی ساری اسلامی دنیا حنفی' شافعی اور مالکی مسالک کی پیروکار تھی۔

۱۸ ویں صدی میں جب وہابیوں کو مختصر عرصے کے لیے ارضِ مقدس پر تسلط حاصل ہوا تو انہوں نے جنونی انداز میں زبردست خونریزی کی۔ اس کے نتیجے میں اسلامی دنیا میں وہابیوں کے خلاف سخت غم و غصے کے جذبات پیدا ہوئے اور مصر سے فوج بھیج کر انہیں شکست سے دوچار کرنا پڑا جس کے بعد وہ صحرا میں تتر بتر ہو گئے۔ لیکن اس دفعہ وہ ایسا کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔

کانگریس میں شرکت کرنے والے وفود

ابن سعود کی کوششوں سے جون ۱۹۲۶ء میں مکہ میں منعقد ہونے والی ورلڈ مسلم کانگریس اسلامی تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی میٹنگ قرار دی گئی۔ ابن سعود نے اپنے افتتاحی خطاب میں اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''شکل اور مقاصد کے لحاظ سے آپ کا یہ اجلاس بلاشبہ اپنی نوعیت کا پہلا اسلامی اجتماع ہے۔''

شروع میں ہی اسے ایک مستقل ادارہ بنانے کا ارادہ ظاہر کیا گیا۔

''ہم اللہ کے حضور دعا گو ہیں کہ یہ کانگریس بار بار ہر سال (اسی طرح حج کے موقع پر) منعقد ہوتی رہے۔''

قاہرہ کی خلافت کانفرنس کے برخلاف مکہ کانفرنس نمائندہ اجتماع ہونے اور نمائندگی کے اعلیٰ معیار' دونوں اعتبارات سے پُرکشش رہی۔ تمام اہم مسلمان گروہوں اور آزاد اسلامی حکومتوں نے شرکت کی (سوائے فارس کے)' برعظیم جنوبی ایشیا سے تمام اہم اسلامی اداروں کے اعلیٰ سطح کے نمائندوں نے مکہ کانفرنس میں شرکت کی۔ مثال کے طور پر ہندوستان کی تحریک خلافت کے وفد کی نمائندگی مولانا سید سلیمان ندوی نے کی' جبکہ وفد کے دوسرے تین ارکان مولانا محمد علی جوہر' ان کے بھائی مولانا شوکت علی اور داماد شعیب قریشی تھے۔ ہندوستانی علماء کا وفد سید محمد کفایت اللہ کی سربراہی میں شرکت کے لیے آیا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے اہل حدیث علماء کا وفد شیخ ثناءاللہ کی سربراہی میں شرکت کر رہا تھا۔

فلسطینی وفد کی سربراہی مفتیٔ اعظم فلسطین سید امین الحسینی نے کی۔ افغان وفد کی سربراہی جنرل غلام جیلانی خان' ترکی کے وفد کی ادیب سروات (Edib Saroit)' مصر کے وفد کی شیخ الظواہری اور روس کے مسلمانوں کے وفد کی سربراہی ریاض الدین فخر الدین نے کی۔ فخر الدین کے وفد کے ساتھ اوفا' استرکان' کازن' کریمیا' سائبیریا اور ترکستان کے وفود تھے۔ جاوا' شام' سوڈان' نجد' حجاز' یمن وغیرہ سے الگ وفود شرکت کے لیے آئے۔

کانگریس میں کئی افراد کو خاص طور پر شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اس گروپ میں شام کے مشہور عالم دین شیخ رشید رضا' جو شیخ محمد عبدہٗ کے شاگرد تھے اور لندن میں مقیم افغان سکالر سردار اقبال علی شاہ شامل تھے۔ آخرالذکر نے برطانیہ میں کانفرنس کے متعلق کئی مضامین تحریر کیے تھے۔ کانفرنس میں جن کی غیر حاضری نمایاں طور پر محسوس کی گئی ان میں فارس' چین کے مسلمان' لیبیا کے سنوسی اور شمال مغربی افریقہ کے بقیہ ممالک شامل تھے۔

قاہرہ اور مکہ کانفرنسوں میں ترکیب کے لحاظ سے ایک اور اہم فرق بھی تھا۔ قاہرہ کانفرنس میں کسی وفد کو سرکاری حیثیت نہیں دی گئی تھی' تمام وفود نجی طور پر شامل ہوئے تھے جبکہ مکہ کانگریس

میں ایسا نہیں تھا۔ اس میں شرکت کے لیے اسلامی ممالک اور گروہوں نے سرکاری وفد روانہ کیے اور اس طرح انہوں نے مکہ کانگریس اور اتحاد کی نئی راہ اپنانے کو ترجیح دی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اُس وقت مسلمانوں کو جن مایوس کن حالات کا سامنا تھا اس کا مداوا وطنی قومیت کو اپنا کر کیا گیا۔

کانگریس میں ابن سعود کا کردار

کانگریس کے افتتاحی اجلاس میں سعودی حکمران ابن سعود نے حجاز کی افسوس ناک تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ شریف حسین نے حجاز کو غیر مسلم تسلط میں دے دیا تھا۔ اس بات سے ابن سعود کا مقصد نجد کی طرف سے حجاز پر قبضے کے لیے جواز پیدا کرنا تھا۔ بادشاہ نے اطمینان کا اظہار کیا کہ حجاز پر قبضے کی بدولت تحفظ اور امن کا ماحول قائم ہو گیا ہے۔ اس افتتاحی بیان میں ابن سعود نے ایمانداری کا مظاہرہ نہیں کیا تھا' اس لیے کہ واقعہ یہ ہے کہ برطانوی حکومت کا جزیرہ نمائے عرب میں اثر و رسوخ بڑھانے میں شریف حسین کے ساتھ خود ابن سعود کا بھی مساوی حصہ تھا۔ بادشاہ نے افتتاحی خطاب کے ذریعے کانگریس کے شرکاء پر وہابی حکومت کا بہترین تاثر چھوڑنے کی کوشش کی۔ تاہم اس نے یہ کہہ کر کہ کانگریس میں بین الاقوامی سیاست کو نہ چھیڑا جائے' گویا اس بات کا اقرار کر لیا کہ سعودی وہابی حکومت کی بقا اور برطانیہ کے ساتھ اس کے قریبی تعلق کو اُمت کی آراء پر فوقیت حاصل رہے گی۔ اس کے بجائے ابن سعود نے کانگریس کے شرکاء کو یہ بے ضرر کام سونپا کہ وہ حرمین کو اسلامی ثقافت اور تعلیم کے بہترین مراکز بنانے اور اس علاقے کی بہبود کے لیے مناسب طریقوں پر غور کریں۔

افتتاحی خطاب سے صاف ظاہر تھا کہ ابن سعود مذہب اور سیاست کو مصنوعی طور پر جدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کے خیال میں مسلمانوں کے اس عالمی اجتماع کے لیے لازم تھا کہ وہ فقط مذہب اور مذہبی امور تک محدود رہیں۔ اسلام کی تاریخ میں یہ گویا ایک نہایت غلط اور بری بدعت کا آغاز تھا۔ بادشاہ کی کوشش تھی کہ اسلام کو جو اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ "دین" ہے' کس طرح مغربی لادینی تصورات کے سانچے میں ڈھال کر محض ایک "مذہب" بنا دیا جائے۔

۲ رجولائی ۱۹۲۶ء کو ۱۵ ویں جلسۂ عام کے موقع پر ابن سعود نے ایک مرتبہ پھر کانگریس کے شرکاء تک اپنا موقف پہنچانے کی کوشش کی۔ اس کی خواہش تھی کہ حجاز پر سعودی وہابیوں کے قبضے کو بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں سے تسلیم کرا لیا جائے۔ اس نے کہا کہ ہم اس مقدس سرزمین میں کسی

قسم کی غیر ملکی مداخلت برداشت نہیں کریں گے' ملک میں ہر کام شریعت کے مطابق ہوگا۔ حجاز میں لازمی طور پر ایک غیر جانبدار حکومت ہونی چاہیے جو نہ کسی پر حملہ کرے اور نہ کوئی اس پر حملہ کرے۔ اس غیر جانبداری کے لیے تمام آزاد مسلم ممالک کو ضمانت دینا ہوگی۔ حجاز کو مختلف مسلم ممالک سے جو مالی امداد ملتی ہے اس کی مناسب تقسیم کے سوال پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اس خطاب کے ذریعے درحقیقت ابن سعود ایک نیا اسلامی سیاسی تصور پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا سعودی وہابی اپنے سوا کسی کو مسلمان تسلیم نہیں کرتے' اور اس طرح گویا اصل دارالاسلام صرف نجد اور حجاز کا علاقہ ہے۔ موجودہ سعودی عرب کے سوا باقی تمام دنیا کو "غیر" قرار دے کر ابن سعود کفر کے قریب پہنچ گیا تھا۔ ہر قسم کی تفریق کے بغیر شریعت نافذ کرنے کا نکتہ درست اور قابل تعریف تھا' تاہم یہ پہلے نکتے سے براہ راست متصادم تھا۔ تمام غیر سعودی "غیر ملکی" تھے لہٰذا ان میں اور سعودیوں میں برابری ممکن نہ تھی۔ مثال کے طور پر "غیر ملکی" مسلمانوں کو حج کے لیے ویزا درکار ہوگا' لیکن سعودی وہابیوں پر اس پابندی کا اطلاق نہیں ہو سکتا' کیونکہ وہ سعودی عرب کی نئی ریاست کے شہری ہیں اور حجاز گویا ان کی اپنی ملکیت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ابن سعود نے دارالاسلام کو ختم کر دیا تھا' اس دارالاسلام کو جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے حجاز میں قائم کیا تھا۔ اور اس طرح مسلمانوں کو عالم اسلام کے قلب سے محروم کر کے اس نے پوری امت کی توہین کی تھی۔ لیکن اس کے باوجود کوئی اس کو روکنے والا نہ تھا۔

حجاز میں غیر جانبدار حکومت سے متعلق ابن سعود کا نکتہ ایک اور بدعت کا آغاز تھا۔ قرآن و حدیث اور امت کی تاریخ میں کہیں حجاز کی غیر جانبداری کا تصور نہیں ملتا۔ ابن سعود کے اس قول کا مطلب کہ حجاز کبھی جنگ میں حصہ نہیں لے گا' یہ تھا کہ عالم اسلام کے قلب کو جہاد سے الگ کر دیا جائے' اور ظاہر ہے کہ یہ بات کفر کے راستے پر چلنے کے مترادف تھی۔ حجاز کی غیر جانبداری کو تسلیم کرانے کی کوشش بھی ڈھکے چھپے انداز میں خود سعودی وہابی حکومت کو تسلیم کرانے کے لیے کی گئی تھی۔

مکہ کانگریس کے شرکاء نے ابن سعود کی طرف سے دی گئی آزادئ اظہار کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آزادی کے ساتھ تقاریر کیں۔ مجموعی طور پر مقررین نے بین الاقوامی سیاست پر بحث نہیں کی' نہ ہی خلافت کا مسئلہ زیر گفتگو لایا گیا۔ تاہم یہ مطالبہ ضرور کیا گیا کہ برطانیہ نے معان اور عقبہ

کے علاقوں کو شرقِ اُردن میں شامل کر کے جو قدم اٹھایا ہے اسے واپس لیا جائے اوران علاقوں کو دوبارہ حجاز کے کنٹرول میں دیا جائے۔ ابن سعود کے چار نکات کے جواب میں کانگریس کے شرکاء نے بحث وتمحیص کے بعد ہوشیاری اور حکمت کے ساتھ اسلام سے اپنی وفاداری کا اظہار کیا اور ابن سعود کی خواہشات کی تصدیق نہیں کی۔ ابن سعود کے لیے یہ ایک بڑا دھچکا تھا' جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کانگریس اس کے بعد ۲۰ برس تک بالکل خوابیدہ پڑی رہی۔

البتہ ایک دوسرے پیچیدہ معاملے میں کانگریس نے ابن سعود کی خواہش کی تکمیل کر دی۔ شاہ سعود نے کہا کہ اگر چہ مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر حرمین میں عبادت کے لیے آزاد ہیں' تاہم وہابی انتظامیہ کسی غیر شرعی حرکت کو برداشت نہیں کرے گی۔ اس مسئلے پر کافی گرما گرمی ہوئی' تاہم شیخ الظواہری نے مفاہمت کروا کر ایک مشترکہ قرارداد پر اتفاق رائے حاصل کرلیا' جس میں رسوم عبادت کی آزادی کا مطالبہ شامل تھا۔ لیکن وہابیوں نے جن مزاروں کو منہدم کر دیا تھا ان کی تعمیر نو کے متنازعہ مسئلے کو نہیں چھیڑا گیا۔ اس معاملے میں خصوصاً ہندوستانی وفد کافی ناراضگی کے ساتھ واپس لوٹا۔

مکہ کانگریس میں جو مفید کام ہوئے ان میں حج کے انتظامات میں بہتری' مواصلات' خصوصاً حجاز ریلوے کا معاملہ' طبّی سہولتیں' خوراک اور پانی کی فراہمی جیسے نکات شامل تھے۔ یہ وہ مسائل تھے جن سے حاجیوں کو ہر سال سابقہ پیش آتا تھا' اور کانگریس نے ان پر بحث کر کے کئی مفید قراردادیں منظور کیں۔

باب پنجم

اقصیٰ اسلامی کانگریس یروشلم

(دسمبر ۱۹۳۱ء)

۱۹۲۶ء میں قاہرہ اور مکہ میں منعقد ہونے والی دو کانفرنسوں کے بعد ہندوستان اور فلسطین کے مسلمانوں کی کوشش کے نتیجے میں دسمبر ۱۹۳۱ء میں یروشلم میں اقصیٰ اسلامی کانگریس منعقد ہوئی۔ اگرچہ مذکورہ بالا دونوں کانفرنسوں کو منعقد ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اس کے باوجود ایک نئی اسلامی کانگریس کی تجویز موجود تھی۔ مفتیٔ اعظم فلسطین، امین الحسینی ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۱ء کے دوران یہودیوں کی فلسطین میں پیش قدمی کو اسلام کے لیے خطرے کا باعث سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں اس خطرے کا مقابلہ سارے مسلمان مل کر ہی کر سکتے تھے۔ اس وقت تک مسلمان اپنی سادہ لوحی کے باعث اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ اس کانگریس کی وساطت سے اسلام کو درپیش خطرے کا حل دریافت کر لیا جائے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ عالم اسلام ایسے اصحابِ دانش سے محروم ہو چکا تھا جو امن وامان، عدل وانصاف اور آزادی کے قیام کے سلسلے میں طاقت کی اہمیت کے قرآنی تصور سے آگاہ ہوں۔

اگست ۱۹۲۹ء میں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان یروشلم میں دیوارِ گریہ کے جھگڑے پر فسادات ہوئے تو لیگ آف نیشنز نے معاملے کی تحقیقات کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا، جس نے یہ رپورٹ دی کہ اگرچہ دیوارِ گریہ بالفعل ملکیت تو مسلمانوں کی ہے مگر اس سے قبل یہ عبادت گاہ یہودیوں کے لیے تھی۔ یہ رپورٹ نہ تو مسلمانوں کو خوش کر سکی اور نہ ہی یہودیوں کو، لہٰذا ایک اسلامی کانفرنس کی ضرورت محسوس ہوئی جو اس مسئلے کا اصل حل تجویز کرے۔

۱۹۳۱ء کے اوائل میں ہندوستانی مسلمان راہنما مولانا محمد علی جوہر کی حرم شریف یروشلم میں تدفین کے موقع پر ان کے بھائی مولانا شوکت علی اور امین الحسینی کے درمیان ایک کانفرنس بلانے کی ضرورت پر اتفاق ہو گیا تھا۔ چند ماہ بعد دیوارِ گریہ کے مسئلے پر کمیشن کی رپورٹ منظر عام پر آئی تو فلسطین کے مسلمانوں کی سپریم کونسل نے مجوزہ کانفرنس بلانے کا اعلانِ عام کیا اور مولانا شوکت

علی نے ۴ ستمبر ۱۹۳۱ء کو مسجد اقصیٰ میں نماز ظہر کے بعد خطاب کرتے ہوئے کانفرنس منعقد کرنے پر اتفاق رائے اور اس کے لیے تاریخ کا باضابطہ اعلان کیا۔ اِس سے عالم اسلام میں ہندوستانی مسلمانوں کی منفرد حیثیت اور قائدانہ صلاحیت اُبھر کر سامنے آئی۔

تاریخ اور مقام

اقصیٰ کی اسلامی کانفرنس یروشلم میں ۶ تا ۱۶ ر دسمبر ۱۹۳۱ء (بمطابق ۲۷ ر جب تا ۷ شعبان) منعقد ہوئی۔ اسلامی کیلنڈر کا حوالہ اس لحاظ سے اہم تھا کہ مسجد الاقصیٰ میں افتتاحی اجلاس کے لیے ۲۷ رجب کا (معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے) خاص طور پر انتخاب کیا گیا تھا۔

اس سے قبل خلافت کانفرنس مصر میں ہوئی تھی، جو برائے نام ہی ایک آزاد ملک تو تھا، اگرچہ اس کی اصل حقیقت انگریز کے ایک حاشیہ بردار ملک کی تھی۔ اسی طرح عالمی مسلم کانفرنس حجاز میں ہوئی، جو بظاہر آزاد مگر حقیقت کے اعتبار سے انگریز کا آلہ کار تھا۔ جبکہ اقصیٰ اسلامی کانفرنس ایک ایسے خطے میں ہو رہی تھی، جس پر براہِ راست برطانیہ کی حکمرانی تھی۔ ۱۹۲۶ء میں یہ بات کہنا آسان نہ تھا کہ مصر یا حجاز کی اصل حیثیت بھی دار الحرب کی ہے۔ ایک طرف جہاں اس میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی کہ ان ہر دو ممالک کے لیے برطانیہ کی رضامندی کے بغیر کوئی بھی قدم اٹھانا ناممکن تھا، وہاں دوسری طرف اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ظاہری طور پر آزاد ملک تھے، لیکن برطانیہ کے قبضے کے بعد فلسطین کے دار الحرب ہونے میں تو کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا۔ اور یقیناً یہ ایک غیر معمولی بات تھی کہ عالم اسلام ایک دار الحرب میں کانفرنس منعقد کرنے کے لیے جمع ہو رہا تھا۔ اس لحاظ سے یہ ایک ایسا منفرد واقعہ تھا، جس کی مثال پوری اسلامی تاریخ میں ملنا مشکل تھی۔

برطانوی حکومت کے لیے یہ ایک نادر موقع تھا۔ چنانچہ اس کی طرف سے اس کانفرنس کا خیر مقدم کیا جانا یقینی بات تھی۔ عالم اسلام خود ہی دار الاسلام کو چھوڑ کر دار الحرب میں جمع ہو رہا تھا۔ چنانچہ برطانیہ نے صرف اپنے ہائی کمشنر کے ذریعے امین الحسینی کو اس انتباہ پر اکتفا کیا کہ ان کی حکومت ایسی کوئی کانفرنس منعقد کرنے کی اجازت نہیں دے گی جس میں ایسے سوالات اٹھائے جائیں جن سے دوست ممالک کے خارجی اور داخلی معاملات پر زد پڑ سکتی ہو۔

صہیونی پریس نے ردعمل کے طور پر کانگریس کے انعقاد پر شدید اندیشے کا اظہار کیا اور

برطانوی حکومت پر الزام عائد کیا کہ یہ کانفرنس اس کی شہ پر ہو رہی ہے اور وہ فلسطین اور ہندوستان کے مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے صہیونی تحریک کو کمزور کرنا چاہتی ہے۔

کئی لوگوں کی طرف سے بڑے زور شور سے یہ چرچا کیا گیا کہ کانگریس عبدالمجید کو بطور خلیفہ یروشلم میں لا بٹھائے گی۔ اس قسم کی کسی کوشش سے انگورہ (اب انقرہ) میں موجود حکومت کمزور ہوتی اور برطانیہ اپنی زیر سرپرستی یروشلم میں خلیفہ کے تقرر کا خیر مقدم کرتا اور اس سے بے پناہ مفاد حاصل کرتا۔

وفود

کانگریس خاصے کھلے ماحول میں منعقد ہوئی۔ لیبیا کے بارے میں اٹلی کی پالیسی پر شدید تنقید کی بنا پر مصر کے عبدالرحمن عظام کے اخراج کے سوا برطانوی حکام نے کانگریس میں کسی قسم کی مداخلت یا حاضرین پر پابندی عائد نہ کی۔ کانگریس میں فارس (بعض شیعہ علماء) ہندوستان (جس کے وفد میں عظیم مسلم دانش ور اور مفکر ڈاکٹر محمد اقبال بھی موجود تھے) یوگوسلاویہ مراکش الجیریا تیونس لیبیا شام اور نائیجیریا سے وفود شامل ہوئے۔ مصر کی حکومت نے اگرچہ سرکاری طور پر اپنا وفد نہ بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اس کے باوجود بادشاہ کی حمایت کرنے کے لیے غیر سرکاری مصری وفود موجود تھے۔ مصر کی وفد پارٹی کی نمائندگی کرنے والے وفد نے ان کی مخالفت کی۔ اس کے علاوہ مصر کی متعدد اسلامی تحریکوں کے نمائندوں نے بھی شرکت کی۔ عراق اور شرقِ اردن کی حکومتوں نے اپنے سرکاری وفود بھیجے۔ سعودی حکمران عبدالعزیز ابن سعود نے پس و پیش سے کام لیتے ہوئے یہ ہوشیاری دکھائی کہ اپنا جو نمائندہ بھیجا وہ بروقت شمولیت کے لیے یروشلم ہی نہ پہنچ پایا۔ ترکی اور افغانستان نے شرکت سے معذوری ظاہر کر دی۔ چنانچہ جولائی ۱۹۲۶ء کی مکہ کانفرنس کے مقابلے میں یروشلم کانفرنس میں سرکاری وفود کی شمولیت انتہائی کم رہی۔

کانگریس کی کارکردگی

مسجد اقصیٰ میں ۲۷ رجب کو مغرب کی نماز کے بعد کانگریس کے رسمی افتتاحی اجلاس میں آٹھ کمیٹیاں مقرر کی گئیں جن کے ذمے ذیل کے امور کا جائزہ لے کر رپورٹ پیش کرنے کا کام لگایا گیا:

کانگریس کا دستور

کانگریس کی نشر و اشاعت اور طباعت

مالیات اور تنظیم

مسلم ثقافت اور الاقصیٰ کی مجوزہ اسلامی یونیورسٹی

حجاز ریلوے

مقامات مقدسہ اور دیوار گریہ

کانگریس کے سامنے پیش کردہ تجاویز

۱۹۲۶ء کی مکہ کانگریس کی طرح یروشلم کانگریس نے بھی اپنا ایک دستور یا منشور اختیار کرلیا۔ مکہ کانگریس کے دستور میں مکہ میں ہر سال ایک اجلاس بلانے کا طے کیا گیا تھا۔ یروشلم کے دستور میں سال میں دو مرتبہ یروشلم میں اجلاس طلب کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مکہ کی طرح یروشلم میں بھی ایک چھوٹا سا سیکرٹیریٹ قائم کیا گیا۔ یروشلم سیکرٹیریٹ چند سال کام کرتا رہا مگر کانگریس کا اس کے بعد کئی سال تک کوئی اجلاس نہ ہوا۔

کانگریس نے یروشلم میں ایک اسلامی یونیورسٹی تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسلامی تعلیم کے لیے الازہر یونیورسٹی کو چونکہ عالم اسلام میں ایک منفرد حیثیت حاصل تھی لہٰذا اس کی طرف سے اس فیصلے کا خیر مقدم نہ کیا جانا قدرتی بات تھی، لیکن کانگریس کے سامنے اہم مسئلہ بہرحال فلسطین کو لاحق صہیونی خطرے کا تھا۔ اس ضمن میں کانگریس کا نقطۂ نظر اور رویہ بلاشبہ وسعت نظری پر مبنی اور معروضی تھا۔ یہودی ایجنسی کے صدر مسٹر سوکولو (Sokolo) کو دعوت دی گئی کہ وہ آ کر کانگریس کے سامنے صہیونی موقف پیش کریں، مگر اس نے مولانا شوکت علی کی یہ پیشکش قبول کرنے سے انکار کردیا، بلکہ صہیونی پریس میں کانگریس کا مذاق اڑایا گیا اور اس کی تضحیک کی گئی۔

صہیونیوں کے اس گروہ کی نسبت ایک دوسرے گروہ نے، جس نے ہیبریو (Hebrew) یونیورسٹی قائم کی تھی، بہتر طرز عمل کا مظاہرہ کیا۔ مؤخر الذکر گروہ نے برطانیہ پر تو دوسرے صہیونیوں کی طرح بڑھ چڑھ کر تنقید کی کہ اس نے فلسطین میں ایسی کانگریس منعقد کرنے کی اجازت کیوں دی، لیکن کانگریس کا ذکر کرنے میں محتاط انداز اختیار کیا۔ البتہ یروشلم کے پرانے رہنے والے مذہبی مزاج کے یہودیوں نے، جن کا صہیونیت کے ساتھ گہرا تعلق نہ تھا، کانگریس کا خیر مقدم کیا اور اس کی کامیابی کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہودیوں کا نہ تو مقامات مقدسہ

پر کوئی حق ہے اور نہ ہی ان پر قبضہ جمانا چاہتے ہیں، لیکن کانگریس کو بھی چاہیے کہ دیوارِ گریہ پر عبادت، کی قدیم یہودی رسم کی راہ میں رکاوٹ پیدا نہ کرے۔

کانگریس نے اس کے جواب میں یہ کارنامہ انجام دیا کہ دیوارِ گریہ کے بارے میں لیگ آف نیشنز کے مقرر کردہ کمیشن کی وہ رپورٹ مسترد کر دی جس میں دیوارِ گریہ پر مسلمانوں کی ملکیت کے ساتھ ساتھ اس پر یہودیوں کے عبادت کرنے کا حق تسلیم کیا گیا تھا۔ اس طرح کانگریس نے صیہونیت کے خلاف جدوجہد میں مذہبی یہودیوں کے ہاتھ مضبوط کرنے کی بجائے انہیں بھی اپنے خلاف کر لیا۔ کانگریس نے لیگ آف نیشنز سے فلسطینی مسلمانوں کے حقوق میں دخل اندازی پر احتجاج کرتے ہوئے اسے یاد دلایا کہ پہلی جنگ عظیم میں عربوں نے اتحادیوں کا ساتھ دیا تھا۔ کانگریس نے خبردار کیا کہ لیگ آف نیشنز کی طرف سے دیے گئے "مینڈیٹ" کا یہ مطلب نہیں کہ عربوں کو محکوم بنا کر ان کے حقوق پامال کیے جائیں۔ کانگریس نے یہودیوں کے فلسطین میں آ کر آباد ہونے اور وہاں زمین اور جائیداد خریدنے پر کوئی اعتراض نہ کیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ کانگریس نے یہودیوں کے فلسطین میں آباد ہونے اور جائیدادیں خریدنے کا حق تسلیم کر لیا تھا۔ تاہم فلسطین میں یہودیوں کی قومی ریاست قائم کرنے کے صیہونی منصوبے کا توڑ کرنے کے لیے کانگریس نے ایک زرعی بینک قائم کرنے کی تجویز منظور کی جو کسانوں اور کاشتکاروں کو مالی امداد فراہم کرے گا تاکہ فلسطینی مسلمان اپنی زمینیں صیہونیوں کے ہاتھ فروخت کرنے پر مجبور نہ ہوں۔

کانگریس نے صیہونی خطرے کے جواب میں انسان دوستی اور مذہبی رواداری پر مبنی طرزِ عمل اختیار کیا جو قوم پرست عربوں کے رویے کے بالکل برعکس تھا۔ کانگریس نے درحقیقت عرب نیشنلزم کے دباؤ کے برخلاف ایک متوازن اور انسانیت پرستانہ موقف اختیار کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ عرب قوم پرستوں نے کانگریس کے دوران اپنا الگ موقف اختیار کیا جسے ممکنہ حد تک یہودیت کا ایک منہ توڑ جواب کہا جا سکتا تھا۔ اس طرح کانگریس کے موقف میں جو کمی تھی اسے پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔ تاہم کانگریس اسلامی جذبے کے تحت ان یہودیوں کو ساتھ ملا کر جو صیہونیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے زیادہ قریب تھے، ایک مشترک موقف اختیار کرنے میں ناکام رہی۔ قرآن نے مسلمانوں کو یہودیوں اور دوسرے غیر مسلموں کے ساتھ ایسے تعلقات قائم کرنے سے یقیناً روکا ہے جن کے نتیجے میں مسلمانوں کو کمتر حیثیت اختیار کرنی پڑے، لیکن

برابری کی سطح پر ایک مشترکہ محاذ یا اتحاد قائم کرنے پر کوئی پابندی نہیں۔

خاص طور سے مایوس کن بات یہ تھی کہ کانگریس عین یروشلم کے مقدس شہر میں بیٹھ کر عالم اسلام کو درپیش مشکل حالات کو صحیح طور پر نہ جانچ سکی' چہ جائیکہ جرأت اور دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کوئی مربوط اور مؤثر حکمت عملی طے کرتی' تاکہ اسلام کو پہنچنے والے نقصانات کو کم کیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر یہ دیکھا جاتا کہ آیا اسلام کی رو سے یروشلم کو مسلمانوں' یہودیوں اور عیسائیوں' تینوں کی مشترکہ تحویل میں دیا جانا ممکن ہے؟ اگر ایسا کوئی سمجھوتہ ہوجاتا تو اسے بنیاد بنا کر لیگ آف نیشنز کے ذریعے یروشلم کو برطانوی تسلط سے آزاد کرانے کی کوشش کی جاتی۔ اس سمجھوتے میں دیوارِ گریہ کو بھی شامل کیا جاسکتا تھا۔ اس طرح کی حکمت عملی اختیار کرنے سے صہیونی عزائم کو ناکام بنانے میں مدد ملتی۔ اس بات کا امکان تھا کہ یروشلم میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے ساتھ مصالحت کے حق میں غیر صہیونی یہودیوں کی طرف سے ایک زبردست آواز بلند ہوتی۔ یروشلم کی حد تک مصالحانہ رویہ اختیار کرکے باقی فلسطین کو بچایا جاسکتا تھا۔ جہاں تک صہیونیوں کا تعلق تھا ان کے لیے بالآخر یروشلم کی یہ حیثیت قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا اور ایک یہودی قومی ریاست قائم کرنے کا ان کا منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچتا۔

کانگریس میں گرما گرم اور پرجوش سیاسی بحث مباحثے کے درمیان ایک آواز ایسی بھی اٹھی جو بلاشبہ ایک مدبر اور دانا انسان کی آواز تھی۔ ڈاکٹر محمد اقبال نے دُور اندیشی سے کام لیتے ہوئے خبردار کیا کہ اسلام کو اصل خطرہ صہیونیت اور سامراجی طاقتوں سے نہیں بلکہ ملحدانہ مادہ پرستی اور وطنی قومیت سے ہے۔ اگر اس کا مقابلہ نہ کیا گیا تو اسلام کا زوال سے دوچار ہونا ناگزیر ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اقبال اسلامی تہذیب کو درپیش عظیم خطرات کو دیکھ رہے تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک ان کے سامنے نظامِ اسلام کی تجدید اور وحدتِ اسلامی کی جانب پیش رفت کا کوئی واضح تصور موجود نہ تھا جس سے کہ تاریخ کے اس نازک موڑ پر اُمت کو ایک واضح راہنمائی ملتی۔

کانگریس کے بعد

کانگریس نے ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی منتخب کی جس نے ایک سال تک بڑی عمدگی سے کام کیا' مختلف ممالک میں تنظیم کی شاخیں قائم کی گئیں اور ان شاخوں کے نمائندے فنڈ جمع کرنے کے لیے ذرائع کی تلاش اور اس کا طریقۂ کار وضع کرنے کے لیے اگست ۱۹۳۲ء میں یروشلم میں جمع

ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں امین الحسینی اور طباہ پاشا (Altabah Pasha) فنڈ جمع کرنے کے لیے ہندوستان اور عراق کے دورے پر نکلے مگر انہیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ لہٰذا نہ یونیورسٹی قائم ہوئی اور نہ کسانوں کی امداد کے لیے زرعی بینک کا قیام عمل میں آیا۔ نومبر ۱۹۳۳ء میں کانگریس کا دوسرا اجلاس بھی نہ ہو سکا۔ اعلیٰ سطحی کمیٹی کی ۱۹۳۴ء میں ایک خاص معاملے کے سلسلے میں وقتی گہما گہمی اور ۵۰ء کی دہائی میں تھوڑے عرصے کے لیے منظر عام پر آنے کے بعد الاقصیٰ اسلامی کانگریس بھی طبعی موت سے ہمکنار ہو گئی۔

کانگریس نے ۱۹۳۱ء میں یروشلم میں جو سیکرٹیریٹ قائم کیا تھا وہ دوسری جنگ عظیم تک کام کرتا رہا۔ تاہم زمانہ جنگ کی سختی اور امین الحسینی اور برطانیہ کے درمیان براہِ راست تصادم سے نبرد آزما ہونا اس کے بس میں نہ تھا۔ امین الحسینی جنگ شروع ہونے پر مصر چلے گئے۔ الاقصیٰ اسلامی کانگریس اور ۱۹۲۶ء کی عالمی مسلم کانگریس کی ناکامی کے اسباب تقریباً ایک جیسے تھے۔ ۱۹۲۶ء اور ۱۹۳۱ء کی اسلامی کانفرنسوں کے پیچھے جو جذبہ کارفرما تھا' ان کانفرنسوں کے حسرتناک انجام کے بعد ۱۹۳۰ء کی دہائی کے نصف تک وہ جذبہ تقریباً ماند پڑ چکا تھا اور کسی میں یہ دم خم باقی نہ رہا تھا کہ وہ عالم اسلام کو منظم کرنے کی نئے سرے سے کوئی کوشش کر سکے۔

مکہ اور یروشلم کے افتتاحی اجلاسوں کے بعد سالانہ اجلاسوں کے عدم انعقاد کی ایک وجہ ان کانفرنسوں کے انتظامی ڈھانچے میں پائی جانے والی ایک خاص کمزوری تھی۔ پرانے عالم اسلام یا دارالاسلام کا معاملہ یہ تھا کہ سلطنت عثمانیہ اور اس کی خلافت کے اندر متعدد آزاد اسلامی ریاستیں موجود تھیں۔ (آزاد ان معنوں میں کہ وہ عثمانیوں سے آزاد تھیں) اس کے باوجود ۱۹۲۶ء میں نظری طور پر سہی قومیتوں سے بالاتر ایک اُمتِ واحدہ کا تصور باقی تھا اور دنیا کا ہر مسلمان' خواہ وہ کسی آزاد ملک کا شہری ہو یا سامراج کے زیر تسلط کسی ملک کا باشندہ' وہ اُمت میں بہرحال شامل تھا اور اسے حق حاصل تھا کہ کسی اسلامی کانفرنس میں آ کر شرکت کرے اور آزاد ممالک کے نمائندوں کے شانہ بشانہ فیصلہ سازی میں حصہ لے۔ مکہ اور یروشلم کی اسلامی کانفرنسوں میں یہی اصول کارفرما تھا۔ تاہم خلافت کے خاتمے کے بعد قومیتوں سے بالاتر ایک اُمت کا تصور کمزور پڑنے لگا' جس کا ایک بڑا سبب مغربی تسلط اور قومی ریاست کا تصور تھا۔ چنانچہ اُمت کی بجائے مختلف قومیتوں پر مبنی آزاد قومی ریاستوں کا نظام وجود میں آ گیا۔ اس نظام میں ایک ریاست کا دوسری ریاست کے

ساتھ تعلق من دیگرم تو دیگری والا تھا اور ان کے آپس کے معاملات دو طرفہ بنیادوں پر طے پاتے۔ حقیقت کے اعتبار سے امت کا وجود باقی نہیں رہا تھا اور دنیا بھر کے مسلمانوں کی نمائندگی کا حق ان کی قومی ریاستوں کو حاصل ہو گیا۔

نئے نظام کے تحت کسی اسلامی کانفرنس یا کانگریس کی بقا اسی طرح ممکن تھی کہ وہ حکومتوں کی سطح پر ہو یا پھر غیر سرکاری سطح پر۔ عالمی مسلم کانگریس کو اس امر کا احساس اس وقت ہوا جب اُس نے ۱۹۴۹ء میں نوزائیدہ اسلامی مملکت پاکستان میں اپنے آپ کو دوبارہ زندہ کیا۔ چنانچہ اس نے اپنی غیر سرکاری حیثیت قبول کر لی جس کی وجہ سے وہ آج تک چل رہی ہے۔ اس کے برعکس آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس (OIC) جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے' ۱۹۶۹ء کی پیداوار ہے اور یہ حکومتی سطح کا ایک ادارہ ہے جس کی رکنیت کی اہل صرف ایک مسلم قومی ریاست ہو سکتی ہے۔

۱۹۵۰ء کی دہائی کے اواخر تک اسلامی کانفرنس کے ان دونوں اجزاء یعنی سرکاری اور غیر سرکاری کے درمیان تقسیم واضح نہیں تھی' جس کا ایک سبب یہ تھا کہ مسلمانوں کے ذہنوں میں ایک اُمتِ مسلمہ کا دھندلا سا تصور اس وقت بھی برقرار تھا۔ دوسرا زیادہ اہم سبب یہ تھا کہ خلافت کے خاتمے کے بعد سامراج کے زیر تسلط مسلمانوں کو اپنی آزاد ریاستیں قائم کرنے میں کم و بیش چالیس برس لگ گئے۔

الاقصیٰ کانگریس کے بعد غیر نو آبادیاتی اسلام

جب آزاد مسلم ریاستیں بالآخر وجود میں آئیں تو ان کی حکومتوں اور مقامی اسلامی تحریکوں کے درمیان تصادم نے بالآخر اسلامی یک جہتی کو سرکاری اور غیر سرکاری سطحوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کی مثال مصری حکومت اور الاخوان' نیز پاکستانی حکومت اور جماعت اسلامی ہیں۔

عالم اسلام کے مختلف خطوں میں شروع ہونے والی اسلامی تحریکوں نے اپنے اپنے خطوں میں اپنے آپ کو مضبوط کرنے پر توجہ صرف کی۔ چنانچہ الاخوان المسلمون عالم عرب میں تو ایک طاقتور سیاسی قوت بن گئی مگر عالمی سطح پر مسلمانوں کی یک جہتی کے لیے وہ کوئی قابل قدر کردار ادا نہ کر سکی۔

ہندوستان کی تحریک خلافت کی جگہ' جس کا ساتھ گاندھی اور ہندوؤں نے دیا تھا' نرم مزاج' جدت پسند اور خلافت مخالف حریف' آل انڈیا مسلم لیگ نے لے لی۔ انڈین نیشنل

کانگریس اور ہندوؤں کی شدید مخالفت کے ساتھ مسلم لیگ نے برعظیم کی تقسیم اور مسلم اکثریت والے علاقوں پر مشتمل پاکستان کے نام سے ایک آزاد اور خودمختار ریاست کا مطالبہ کر دیا۔ اس مطالبے کو جسے سب سے پہلے علامہ اقبال نے پیش کیا تھا' انجام کار مسلمانوں کی اکثریت کی حمایت حاصل ہوگئی۔ ہندوستان کی پرانی مسلمان قیادت کی جگہ محمد علی جناح اور لیاقت علی خان وغیرہ کی سربراہی میں ایک نئی قیادت نے لے لی۔ ہندوستانی مسلمان کے ان رہنماؤں کو عالم اسلام میں وہ مقام و مرتبہ حاصل نہ تھا جو مولانا محمد علی جوہر' مولانا شوکت علی اور سید سلیمان ندوی جیسے راہنماؤں کو حاصل تھا۔ مگر اندرون ملک انہیں مسلمانوں کی اس قدر بھرپور حمایت حاصل ہوگئی کہ قدامت پسند علماء (جن کے سربراہ مولانا حسین احمد مدنی تھے) اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی قائم کردہ نئی جاندار اسلامی تحریک' جماعت اسلامی' کی مخالفت بھی ان کا راستہ نہ روک سکی۔

نئی قیادت نے کلی طور پر اپنے آپ کو پاکستان کے حصول کی جدوجہد میں لگا دیا اور اس طرح اسلامی کانفرنس کی سیاست سے ایک اہم اور سرگرم رکن پیچھے ہٹ گیا۔

جزیرہ نمائے عرب کی حد تک ابن سعود ایسا کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا جس سے نجد اور حجاز میں نئی قائم ہونے والی سعودی عرب کی بادشاہت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا۔ چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے پورے عرصے میں اور ۱۹۵۳ء میں ابن سعود کی وفات تک سعودی عرب دنیا بھر کے مسلمانوں کے درمیان یک جہتی پیدا کرنے کی کوششوں سے الگ تھلگ رہا۔ جنگ کے بعد بھی مسلم دنیا بحرانی کیفیت سے دوچار رہی۔ برطانیہ کے اس اچانک اعلان سے کہ وہ اپنے مقبوضہ علاقے خالی کر دے گا' فلسطین اور ہندوستان میں حالات بڑی تیزی سے بگڑنے لگے۔ انڈونیشیا میں ڈاکٹر حطہ اور سوئیکارنو کی قیادت میں پرتگیزیوں کے خلاف مزاحمتی تحریک زور پکڑنے لگی۔ ترکی میں اگرچہ اسلام کے احیاء کا دھندلا سا آغاز ہوگیا تھا' مگر اس سے مصطفی کمال کی جدید سیکولر جمہوریہ کو کسی قسم کا کوئی اندیشہ نہ تھا' جدید ترکی عالم اسلام کی بجائے اپنے آپ کو یورپ کا حصہ شمار کر رہا تھا۔ اس نے دوسری جنگ عظیم اتحادیوں کے ساتھ مل کر لڑی تھی۔ چنانچہ اسے رسمی طور پر نیٹو NATO (نارتھ اٹلانٹک ٹریٹی آرگنائزیشن) میں شامل بھی کر لیا گیا۔

۱۹۴۷ء میں محمد علی جناح کی زیر قیادت آل انڈیا مسلم لیگ اسلامی جمہوریہ پاکستان قائم کرانے میں کامیاب ہوگئی۔ مسلمان عوام کو دو سو برس زوال کے بعد پہلی دفعہ اتنی شاندار فتح حاصل ہوئی

تھی جس سے وہ وقت قریب دکھائی دینے لگا کہ جب پوری دنیا کے مسلمان غیروں کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ مزید براں پاکستان کے قیام کے لیے لڑی جانے والی نظریاتی جنگ کی کامیابی نے اس ملک کو ایک حقیقی اسلامی مملکت (دارالاسلام) بنانے کی راہ ہموار کر دی تھی۔

پاکستان وسیع پیمانے پر ہونے والی خون ریزی، قتل و غارت اور لوٹ مار، جس میں مسلمان، ہندو اور سکھ، تینوں ملوث تھے، کے مراحل سے گزر کر وجود میں آیا تھا۔ مسلمان اس لیے ان حملوں کا زیادہ نشانہ بنے تھے کہ ہندو اور سکھ ہندوستان کی تقسیم سے سخت دل برداشتہ تھے۔ بعض تخمینوں کے مطابق تقسیم کے دوران ۵ لاکھ کے لگ بھگ لوگ قتل ہوئے۔ ابھی یہ مصائب ختم نہیں ہوئے تھے کہ جلد ہی اس نوزائیدہ ملک کو کشمیر کے مسئلے پر ہندوستان کے ساتھ جنگ میں الجھنا پڑا۔

فلسطین سے جاتے ہوئے برطانیہ اپنے پیچھے اسرائیل کی نئی صیہونی ریاست قائم کر گیا تھا، جس کی وجہ سے سال ۱۹۴۸ء کا بیشتر عرصہ اسرائیل اور عرب فوجیں آپس میں برسرِ پیکار رہیں۔ یہودی ریاست آہستہ آہستہ ثابت قدمی سے اپنے پاؤں پھیلاتی چلی گئی، یہاں تک کہ ۱۹۴۹ء میں عارضی جنگ بندی کے وقت نہ صرف مغربی یروشلم اس کے قبضے میں آ چکا تھا بلکہ اس نے ایلات کی بندرگاہ پر قبضہ کر کے بحیرۂ احمر تک بھی رسائی حاصل کر لی تھی۔ عربوں کی مشترکہ فوج کو تقریباً ہر محاذ پر شکست سے دوچار ہونا پڑا، سوائے یروشلم کے پرانے حصے اور حرم شریف کے، جسے وہ بچانے میں کامیاب ہوئے۔

ہندوستان کی تقسیم اور کشمیر کی جنگ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان شدید نفرت پیدا کر دی، یہی معاملہ فلسطین میں ہوا۔ اسرائیل کے قیام اور فلسطین میں جنگ نے یہودیوں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے متنفر کر دیا۔ صدیوں پہلے صلیبی جنگوں، بازنطینیوں کی شکست، قسطنطنیہ پر غلبہ اور پھر مغرب کے سامراجی اور نوآبادیاتی نظام کے جبر کے، ان سب نے عیسائیوں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور حقارت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ چنانچہ بیسویں صدی کا نصفِ اوّل ختم ہونے تک مسلمان دنیا بھر میں یکا و تنہا چاروں طرف سے دشمنوں میں گھر چکے تھے۔ اس پر مستزاد داخلی انتشار اور مغرب کے دیے ہوئے وطنی قومیت پر مبنی بین الاقوامی نظام کے تحت منقسم اُمت مغرب کی آلۂ کار بن کر رہ گئی اور اپنی چودہ سو سالہ تاریخ کے سب سے کٹھن دور میں داخل ہو گئی۔

باب ششم

جنگ عظیم دوم کے بعد

(۱۹۴۹ء۔ ۱۹۵۴ء)

پاکستان...... ورلڈ مسلم کانگریس کا احیاء

خلافت کے خاتمے سے جو خلاء پیدا ہو گیا تھا اسے پُر کرنے اور مسلمانانِ عالم کو دوبارہ اتحاد اور یک جہتی کی راہ پر ڈالنے کے لیے جنگ عظیم دوم کے بعد جو پہلی کوشش ہوئی اس کی سعادت نوزائیدہ اسلامی مملکت "پاکستان" کے حصے میں آئی۔ ۱۹۲۶ء میں منعقد ہونے والی پہلی ورلڈ مسلم کانگریس کے ۲۳ سال بعد اس ادارے کو فروری ۱۹۴۹ء میں پاکستان میں دوبارہ زندہ کیا گیا۔

چنانچہ کراچی میں ایک کانفرنس منعقد کی گئی اور پاکستان کے پہلے اور آخری شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کو اس کانفرنس کا صدر منتخب کیا گیا۔ کانفرنس میں پاکستان، عراق، مصر، ایران، ترکی، افغانستان، دی مغرب (شمالی افریقہ)، سعودی عرب، لبنان، جزائر مالدیپ، سیلون، مراکو، جنوبی افریقہ کے ایک صوبے (ٹرانس وال) اور عرب لیگ کے نمائندوں نے شرکت کی۔ کانگریس کے احیاء کے علاوہ اس کانفرنس کی نمایاں خصوصیت پاکستان کا اس میں اہم کردار ادا کرنا تھا۔ پاکستان کے پیش نظر بظاہر مسلمانوں کے بین الاقوامی اتحاد کے ذریعے بھارتی خطرے کے خلاف اپنی سلامتی کا دفاع کرنا تھا۔ انتہائی غیر یقینی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے پاکستان نے اسلام کو اپنی خارجہ پالیسی میں ایک اہم عنصر کے طور پر استعمال کیا۔ بابائے قوم محمد علی جناح چند ماہ قبل ماہِ ستمبر ۱۹۴۸ء میں انتقال کر گئے تھے جس کی وجہ سے پاکستان کو یہ خطرہ تھا کہ بھارت اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ کانفرنس کا فوری فائدہ یہ ہوا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان جاری کشمیر میں جنگ بند ہو گئی۔

یہاں یہ بھی بتا دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ پاکستان نے اپنی سلامتی کے تحفظ کے لیے کبھی مسلمانوں کے درمیان اتحاد اور یک جہتی پیدا کرنے کا عمل شروع کر کے اسے ایک حد تک تقویت تو فراہم کر دی، لیکن ساتھ ہی خود امریکہ کی جھولی میں جا گرا۔ پاکستان کی یہ دورخی بعد میں

اس کی خارجہ پالیسی میں مستقل شکل اختیار کر گئی۔

پاکستان کے اس اقدام کے کئی دیگر اہم مضمرات بھی تھے۔ پاکستان اس نظریے کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا کہ مسلمان اور ہندو دو الگ الگ قومیں ہیں، جسے ''مسلم قومیت'' کا نام دیا گیا تھا' لیکن جب پاکستان بن گیا تو پاکستانی مسلمان پھر بھی اپنے آپ کو ایک الگ قوم سمجھتے رہے اور باقی دنیا کے مسلمانوں سے الگ ایک قوم بنے رہے۔ اسے ''پاکستانی مسلمان قوم'' کا نام دیا گیا۔ جب دنیا کے مسلمان مختلف قوموں میں بٹ کر پاکستانی' مصری' ایرانی' سعودی وغیرہ بن گئے تو اسلامی یکجہتی کی نوعیت بھی تبدیل ہو کر ''بین الاقوامی'' ہو گئی۔ چنانچہ ورلڈ مسلم کانگریس کی حیثیت ایک بین الاقوامی ادارے کی ہی ہو سکتی تھی جس کا کام مسلمان ''قوموں'' کی نمائندگی ہوتا۔ لہٰذا ۱۹۲۶ء میں کانگریس سے جو کام ابن سعود لینا چاہتے تھے' وہ بالکل اسی نہج پر پہنچ گئی تھی۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے' اس نے اپنے طرزِ عمل سے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مار لی۔ اس لیے کہ اگر پاکستانی قومیت جائز ہو سکتی تھی تو بنگالی یا سندھی قومیت بھی جائز تھی' کیونکہ پاکستان میں مختلف نسلوں اور قبیلوں کے لوگ آباد تھے۔ لہٰذا اب مجبوراً اسے سیکولرزم کا سہارا لینا پڑا اور یہ کہا گیا کہ تمام پاکستانی بلا لحاظِ مذہب و عقیدہ ایک قوم ہیں اور یہ کہ جناح خود بھی وفات سے قبل اسی ''سیکولر پاکستانی قومیت'' کے حق میں تھے۔

بہر حال جناح کے بعد نئی قیادت کو جب بھارتی خطرات کا سامنا ہوا تو اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ملک کے تحفظ کی خاطر ''بین الاقوامی اتحاد پالیسی'' کا سہارا لیا جائے' جس کے لیے سیکولر پاکستانی قومیت کی بجائے ''مسلم پاکستانی قومیت'' کا نعرہ بلند کرنا ضروری تھا۔ البتہ جہاں تک اتحاد بین المسلمین کے لیے خلافت کے احیاء کا تعلق تھا تو ابن سعود کی پیروی میں ورلڈ مسلم کانگریس میں نئے سرے سے جان ڈالنے کی کوشش کر کے پاکستان نے یہ ثابت کر دیا کہ اس کے نزدیک خلافت کے احیاء کی کوئی اہمیت نہیں اور نہ ہی اسے دارالاسلام کے قیام سے دلچسپی ہے' بلکہ ترکی اور آلِ سعود کی پیروی میں ایک جدید مسلمان ریاست قائم کرنا مطلوب ہے۔ دارالاسلام کے قیام کے لیے عالم اسلام کے سامنے جو مشکلات اور رکاوٹیں درپیش تھیں ان سے قطع نظر پاکستان کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ حقیقی اسلام کی جانب پیش رفت کے نتیجے میں امریکہ سے اس کے تعلقات خراب ہوتے' جبکہ اِس کی سلامتی کا سارا دارومدار امریکہ پر تھا۔ اس کے علاوہ اگر

پاکستان کو دارالاسلام کی حیثیت حاصل ہو جاتی تو اس سے سعودی حکومت فوری طور پر عدم استحکام سے دوچار ہوتی' جبکہ عالم اسلام پر اپنا تسلط قائم رکھنے کے لیے برطانیہ اور امریکہ کے نزدیک سعودی عرب کی مرکزی اہمیت تھی۔

حکومت پاکستان نے تندہی سے کانفرنس کا اہتمام کیا تھا اور اس میں اسے طبقہ علماء اور عوام کا بھرپور تعاون بھی حاصل رہا تھا۔ تاہم یہ واضح نہیں تھا کہ کانگریس حکومتوں کی سطح پر کام کرے گی یا غیر سرکاری طور پر۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ حکومت پاکستان کانگریس کو ایک سرکاری ادارہ ہی سمجھ رہی تھی اور اپنے دفاعی مقاصد کے حصول میں اسے بطور زینہ استعمال کرنے کی خواہش مند تھی۔

انٹرنیشنل اسلامک اکنامک کانفرنس

اسی سال کے اندر اندر ایک اور بین الاقوامی اسلامی کانفرنس منعقد ہوگئی۔ اس کا انعقاد بھی کراچی میں ہوا۔ اگرچہ اس کانفرنس کا اہتمام شہر کے کاروباری حلقوں نے کیا تھا مگر دسمبر ۱۹۴۹ء میں اس کا انعقاد بھی حکومت پاکستان کی سربراہی میں ہی ہوا۔ جناح نے اپنی وفات سے قبل خود بھی ایک ایسی کانفرنس منعقد کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی جس کا تعلق مسلمانوں کی معاشی زندگی سے ہو' چنانچہ انہوں نے یہ کام اپنے وزیر مال غلام محمد کے سپرد کیا تھا اور انہی کی کوشش سے یہ کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔

وزیراعظم لیاقت علی خان نے اپنے افتتاحی خطاب میں بڑی تفصیل سے مسلمانوں کو درپیش سیاسی اور معاشی مسائل کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کے پاس کسی شے کی کمی نہیں ہے' اللہ نے انہیں قدرتی وسائل سے مالا مال خطے عطا کیے ہیں اور فوجی لحاظ سے بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ انہیں مغربی جمہوریت یا کمیونزم کی طرف دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے' کیونکہ ان کے پاس اللہ کا دیا ہوا ایک بہترین نظام موجود ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم بڑی طاقتوں کے دباؤ سے باہر آئیں اور آپس میں تعاون کے ذریعے معاشی روابط قائم کریں۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ بینکنگ' جہاز رانی اور انشورنس جیسے شعبوں میں تعاون کا فوری طور پر آغاز کیا جا سکتا ہے۔

کانفرنس نے کراچی کو اپنا صدر مقام بنانے کا فیصلہ کیا' جس کے لیے وہاں ایک سیکرٹیریٹ قائم کرنے کی تجویز منظور کی گئی۔ اس کے علاوہ کئی ایک اہم شعبوں میں' جن میں زراعت کا شعبہ

سرفہرست تھا' تعاون بڑھانے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ یہ کانفرنس ہر سال ہوا کرے گی۔ چنانچہ اگلی کانفرنس پروگرام کے مطابق اکتوبر ۱۹۵۰ء میں ہوئی' جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ معاشی میدان میں باہمی تعاون کے ذریعے مسلمانوں کے درمیان اتحاد اور یک جہتی پیدا کرنے کے عمل کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ پاکستان نے اس کانفرنس میں نمایاں کردار ادا کیا۔ پاکستان کے وزیر مال غلام محمد نے ۳/اکتوبر کو اپنے خطاب سے کانفرنس کا افتتاح کیا اور بعد میں ہونے والی کارروائی میں بھی پاکستان نے مرکزی کردار ادا کیا۔

ایران کے اسرائیل کے ساتھ تعلقات کے پیش نظر عرب حکومتوں کی اس کانفرنس میں شرکت غیر یقینی تھی۔ لیکن عرب لیگ کے نمائندوں نے اسکندریہ میں اپنے اجلاس میں ایران کی یہ وضاحت قبول کرلی کہ اس نے اسرائیل کا صرف وجود تسلیم کیا ہے اس کے ساتھ تجارتی لین دین یا قرضوں کے بارے میں اس سے کوئی مذاکرات نہیں کیے۔

اس کانفرنس میں مندرجہ ذیل ممالک سے نمائندے شرکت کے لیے آئے۔ افغانستان' مصر' انڈونیشیا (جو ۱۹۴۹ء کی کانفرنس میں غیر حاضر رہا تھا)' ایران' عراق' اردن' لیبیا' پاکستان' سعودی عرب' شام اور ترکی۔ اس کے علاوہ بھارت اور سری لنکا کی مسلمان اقلیتوں کے نمائندے بھی شریک ہوئے۔ کانفرنس نے مختلف امور کا جائزہ لینے کے لیے دس کمیٹیاں قائم کیں۔ پاکستان کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ان دس میں سے پانچ کمیٹیوں کے چیئرمین پاکستانی تھے۔

کانفرنس نے جو فیصلے کیے ان میں یہ فیصلے خاص طور پر قابل ذکر ہیں (اور ان فیصلوں کی صدائے بازگشت ان قراردادوں میں بھی سنائی دیتی ہے جو ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائیوں کے وسط میں منعقد ہونے والی وزرائے خارجہ کی سطح کی اسلامی کانفرنسوں میں منظور کی گئیں):

- ☆ ماہرین کے ایسے مستقل گروپ قائم کیے جائیں جو تھوڑے تھوڑے وقفوں سے اپنے اجلاسوں میں مختلف مسلم ممالک کے درمیان مالی تعاون کا جائزہ لیتے رہیں۔
- ☆ بینکاری سے متعلق شرائط طے کرنے میں ایک دوسرے سے تعاون کیا جائے۔ ایک ملک سے دوسرے ملک میں رقوم کی منتقلی میں سہولتیں پیدا کی جائیں۔
- ☆ بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے ساتھ روابط میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ مسلمان ممالک

سے متعلق مالی معلومات اور اعداد و شمار کی فراہمی اور باہمی تبادلہ وغیرہ۔

مزید برآں کانفرنس نے مسلمان ممالک کی حکومتوں سے سفارش کی کہ کسی مسلمان ملک سے آنے والے افراد کو اپنے ہاں ملازمت دینے میں ترجیح دیں، ایک اسلامی لیبر فیڈریشن کے قیام میں تعاون کریں اور مالکوں اور ملازموں کی امداد باہمی کی سوسائٹیاں بنانے کی حوصلہ افزائی کریں۔

ان اقدامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کانفرنس نے مسلمانوں کے درمیان اتحاد اور یکجہتی پیدا کرنے میں عملی پیش رفت کا اہتمام کر دیا تھا اور درحقیقت یہی وہ سب سے اہم اور قابل ذکر کامیابی تھی جو اس کانفرنس کے ذریعے حاصل ہوئی تھی۔ اس سے یہ امکان بھی نظر آنے لگا تھا کہ اگر سیاسی اختلافات سے ہٹ کر صرف معاشی سطح پر تعاون کو فروغ دیا جائے تو مسلمانانِ عالم کے باہمی اتحاد کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔ یہ ابتداء تو ولولہ انگیز اور پر جوش تھی لیکن حسب معمول تہران کانفرنس کے بعد اگلے سالانہ اجلاس کے منعقد ہونے کی نوبت نہ آ سکی، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ بین الاقوامی اسلامی اتحاد قائم کرنا آسان کام نہیں۔ پاکستان عالم اسلام کی یک جہتی کے لیے جو کردار ادا کرنے کا خواہاں تھا اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خود اس کے اپنے بین الاقوامی سیاسی تعلقات تھے، چہ جائیکہ عالم اسلام کے اندرونی اختلافات اور تضادات دور کرانے کی کوئی سعی و جہد کی جاتی۔

ورلڈ مسلم کانگریس

فروری ۱۹۵۱ء میں ورلڈ مسلم کانگریس کا ایک اور اجلاس پاکستان میں منعقد ہوا۔ یہ اجلاس ۱۹۴۹ء کے اجلاس کے مقابلے میں زیادہ کامیاب تھا، کیونکہ اس میں کئی اور مسلم ممالک سے بھی نمائندے شریک ہوئے تھے۔ اس کا افتتاح بھی وزیر اعظم لیاقت علی خان نے کیا (جنہیں چند ہی ماہ بعد قتل کر دیا گیا)۔ اسلام کی جانب پیش رفت میں پاکستان کو جو اہمیت حاصل ہو گئی تھی یہ کانفرنس اسی کا مظہر تھی۔ حبیب بورقیبہ (تیونس کے آئندہ ہونے والے صدر) اور حسن عبداللہ (صومالیہ کے اگلے صدر) بھی اس کانفرنس میں شریک تھے۔

کانفرنس میں مشرق وسطیٰ اور مسلمانوں کی آزادی کی تحریکوں، خصوصاً شمالی افریقہ میں جاری تحریکوں کے حق میں قراردادیں منظور کی گئیں۔ کانفرنس نے بھارت کے ساتھ کشمیر کے تنازعے میں پاکستان کی حمایت کا اعلان بھی کیا، مگر کانفرنس کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس میں

مسلم ممالک کے درمیان ایک مشترکہ دفاع کے معاہدے کا اعلان کیا گیا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ کسی بھی مسلمان ملک کے خلاف ہونے والی جارحیت کو تمام مسلم ممالک کے خلاف جارحیت تصور کیا جائے گا۔ کراچی میں ورلڈ مسلم کانگریس کا ایک چھوٹا سا سیکرٹیریٹ بھی قائم کیا گیا' جو اب تک قائم ہے۔

اس وقت یہ بات کھل کر سامنے آ چکی تھی کہ ورلڈ مسلم کانگریس کی حیثیت حکومتوں کی سطح کے ایک ادارے کی ہو گی۔ پاکستان کو اس کی بدولت اپنے دفاع کو مضبوط بنانے میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی مگر بعد میں یہی کامیابی اس کی سب سے بڑی کمزوری بن گئی' کیونکہ اس سے بھارت کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ پاکستان اسلام کو غلط طور پر اپنے مفاد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ بھارت کا کہنا تھا کہ اس کا کسی دوسرے اسلامی ملک کے ساتھ کسی قسم کا جھگڑا نہیں اور مسلم اتحاد کے نام پر اس کے خلاف ہونے والے پروپیگنڈے سے سوائے منفی اثرات مرتب کرنے کے کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہو گا۔ چنانچہ بھارت کی یہ حکمت عملی جلد ہی کامیاب ثابت ہوئی اور پاکستان کو الٹا لینے کے دینے پڑ گئے۔

انتقال شیخ الاسلام

شیخ الاسلام شبیر احمد عثمانی مرحوم' جن کا ۱۹۵۰ء میں انتقال ہوا تھا' کا ۱۶/فروری ۱۹۵۲ء کو سالانہ عرس تھا۔ اس موقع پر عالم اسلام کے کئی ممتاز علماء کراچی میں جمع ہوئے اور ایک اسلامی کانفرنس میں شریک ہوئے' جس کا اہتمام پاکستانی علماء کی ایک ایسوسی ایشن نے کیا تھا۔ مفتیٔ اعظم فلسطین امین الحسینی نے' جو اس کانفرنس کی صدارت کر رہے تھے' عالم اسلام کی یکجہتی کے لیے ایک اسلامی بلاک قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ اسلام کی رو سے امت مسلمہ کے اتحاد کے لیے جدّ وجہد کرنا ہر مسلمان کا فرضِ منصبی ہے۔ اصولی طور پر ان کی یہ بات صد فیصد درست تھی' قرآن کی رو سے تمام مسلمان ایک اُمت ہیں' لیکن سوال تو یہ تھا کہ وہ امت بالفعل موجود بھی تھی؟ حال یہ تھا کہ مسلمان پاکستانی' مصری' ایرانی' سعودی وغیرہ قوموں میں بٹے ہوئے تھے۔ کانگریس کے شرکاء میں سے کسی ایک کی نظر بھی اس طرف نہ گئی۔

ورلڈ مسلم کانگریس

کراچی میں ۱۶/ فروری کو عرس کے موقع پر جو علماء کانفرنس ہوئی تھی اس کے کچھ روز بعد

۱۴ سے ۱۷/مارچ ۱۹۵۲ء تک کراچی میں ہی ورلڈ مسلم کانگریس کی شوریٰ کا ایک اجلاس ہوا' جس میں بارہ مسلم ممالک سے غیر سرکاری نمائندے شریک ہوئے۔ اجلاس میں مسلم ممالک کی ایک دولت مشترکہ قائم کرنے اور تمام مسلمانوں کو اسلامی شہریت دینے کی سفارش کی گئی تاکہ ایک مسلمان کو کسی بھی اسلامی ملک میں آزادانہ آنے جانے کی سہولت حاصل ہو۔ اس کے علاوہ شمالی اور جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کے حق میں نیز فلسطین میں مسلط کی گئی صہیونی ریاست کے خلاف قراردادیں منظور کی گئیں۔ کراچی میں کانگریس کا مستقل ہیڈ کوارٹر قائم کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔

عالم اسلام جس بین الاقوامی نظام کا حصہ بن رہا تھا اس کے تحت مسلمان ممالک کی دولت مشترکہ کا قیام تو شاید زیادہ قابل اعتراض بات نہ ہوتی لیکن ''اسلامی شہریت'' کی تجویز کا تو براہ راست دارالاسلام کے ساتھ جا کر تعلق جڑتا' گویا اس کا مطلب اسلام کا احیاء ہوتا۔ لیکن جس کونسل میں یہ تجویز منظور کی گئی تھی اس میں کوئی حکومتی نمائندہ شریک نہیں تھا' لہٰذا اس کی حیثیت بالکل غیر سرکاری تھی۔

بین الاسلامی ریاستی مشاورتی کونسل

ورلڈ مسلم کانگریس کونسل کی مسلم ممالک کی دولت مشترکہ کی تجویز کے متوازی حکومت پاکستان نے کراچی میں مسلم ممالک کی ایک کانفرنس بلانے کی کوششیں شروع کر دیں' جس کا مقصد ایک بین الاسلامی ریاستی مشاورتی کونسل قائم کرانا تھا۔ پاکستان کے وزیر خارجہ محمد ظفر اللہ خان نے مجوزہ مشاورتی کونسل کے مقاصد ان الفاظ میں بیان کیے:

> ''ایک سنٹرل اتھارٹی کے زیر سرکردگی اسلامی ممالک کا ایک ایسا بلاک جلد از جلد قائم کیا جائے جو مسلم ممالک کے درمیان تعاون کے لیے رابطے کا کام کرے۔''

مجوزہ بلاک کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے مزید بتایا کہ یہ بلاک مغربی سامراجی بلاک اور کمیونسٹ بلاک دونوں سے الگ اپنا کام کرے گا' گویا اس کی حیثیت ''تیسری طاقت'' کی ہو گی۔ ظفر اللہ خان دراصل اس سے اندرونی مخالفین اور بیرونی ناقدین کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خان (مرحوم) کے مشہورِ زمانہ دورۂ امریکہ کے بعد بھی دونوں بڑی طاقتوں کے حوالے سے پاکستان کی خارجہ پالیسی غیر وابستگی پر مبنی

ہے، لیکن انہوں نے جو تجویز پیش کی تھی وہ درحقیقت غیر وابستگی سے بھی ایک قدم آگے تھی، یعنی دو بڑی طاقتوں کے حلقہ اثر سے باہر ایک تیسری بڑی طاقت کا قیام، جس کی بنیادیں بین الاقوامی اسلامی یکجہتی پر استوار ہوں۔

پاکستان کی تمام تر سفارتی کوششوں کے باوجود مذکورہ بالا کانفرنس منعقد نہ ہو سکی۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ عام تاثر یہ تھا کہ پاکستان کی عالم اسلام کو یکجا کرنے کی کوشش درحقیقت مغربی طاقتوں کے مفاد میں ہے۔ دوسرے یہ کہ پاکستان بھارت کے ساتھ اپنے کشیدہ تعلقات کی وجہ سے اپنا سیاسی مسئلہ حل کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے ظفر اللہ خان کی بات میں وہ وزن نہ تھا جو ہونا چاہیے تھا۔ ادھر نہرو نے یہ کہہ کر خبردار کر دیا تھا کہ مذہب کے نام پر علاقائی گروہ بندی کا نتیجہ امن نہیں جنگ ہوگا، جس سے یہ محسوس ہوا کہ پاکستان کے اقدامات سے بھارت کے ساتھ عرب ممالک کے تعلقات خراب ہو سکتے ہیں۔

۱۹۵۰ء کے آخر میں پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے امریکہ کا ایک غیر معمولی دورہ کیا تھا۔ سرد جنگ کے حوالے سے امریکہ کے نزدیک یہ دورہ اس لحاظ سے اہم تھا کہ یورپ پر امریکہ کو فوقیت دی گئی تھی۔ اس طرح امریکہ کو عالم اسلام کے ساتھ تعلقات استوار کرنے میں مدد مل سکتی تھی، جبکہ پاکستان کو بھارتی خطرے کے خلاف امریکی امداد درکار تھی۔ اس طرح گویا امریکہ اور عالم اسلام، دونوں کے ساتھ گہرے تعلقات قائم کرنا پاکستان کی خارجہ پالیسی کا بنیادی مقصد قرار پایا۔ بہرحال اس دورے سے پاکستان کو اقوامِ عالم میں اپنے آپ کو متعارف کرانے میں خاصی مدد ملی۔ نیز کوریا میں جاری جنگ کے سبب پاکستان کو ۱۹۵۲ء تک پٹ سن اور دیگر اشیاء کی برآمد سے خاصا زرِ مبادلہ بھی ہاتھ آیا، جو ایک طرح دیگر ایفرو ایشیائی ممالک کے لیے رقابت کا باعث بنا۔

۱۹۵۱ء میں لیاقت علی خان کو قتل کر دیا گیا۔ ادھر امریکہ میں ۱۹۵۲ء میں نئے ری پبلکن صدر آئزن ہاور آ گئے۔ لیاقت علی خان کے بعد خواجہ ناظم الدین نے امریکہ اور عالم اسلام کے ساتھ اپنے تعلقات میں توازن جاری رکھا، لیکن خواجہ ناظم الدین کے بعد سیکولر وزیر اعظم محمد علی بوگرہ اقتدار میں آئے تو یہ پالیسی ایک دم تبدیل ہو گئی۔ محمد علی بوگرہ کو، جو امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے، ایک محلاتی سازش کے نتیجے میں واپس بلا کر وزیر اعظم مقرر کیا گیا تھا۔ انہوں نے سب

سے پہلا کام یہ کیا کہ امریکہ کی زیر سرپرستی برطانیہ، ایران، ترکی اور عراق کے ساتھ ایک فوجی معاہدے میں شریک ہو گئے، جس کے بعد پاکستان کے امریکہ کے حاشیہ بردار ہونے میں کسی کو کوئی شک وشبہ نہ رہا۔ بھارت نے شروع سے ہی بڑی ہوشیاری کے ساتھ پاکستان کو ناکام بنانے کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی، لہٰذا اس نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا اور پاکستان کے لیے عالم عرب میں پیدا ہونے والی مخالفانہ لہر کا مقابلہ کرنا ممکن نہ رہا۔ اسرائیل کے قیام کے خلاف اقوام متحدہ میں پاکستان کی دلیرانہ جدّ وجہد اور ہر موقع پر عربوں کی حمایت کے باوجود آج پاکستان عربوں سے کٹ گیا تھا، اس لیے کہ عرب اسرائیل کے قیام کا ذمہ دار امریکہ کو گردانتے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ پاکستان امریکہ کا حاشیہ بردار بن کر عربوں اور مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں ہو سکتا۔

۱۹۵۲ء میں مصر کے انقلاب نے امریکہ اور برطانیہ کے خلاف عربوں کی نفرت کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ مصر میں نئی حکومت قائم ہوئی تو قوم پرستی کے جوش میں اس نے ملک کو مغرب کے سامراجی اثرات سے پاک کرنے کا آغاز کیا اور نہر سویز کو قومی ملکیت میں لے لیا، جس پر ۱۹۵۵ء میں برطانیہ، فرانس اور اسرائیل نے مل کر مصر پر حملہ کر دیا۔

اتحاد اسلامی کا خواب اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا تھا جب تک پاکستان امریکہ کے حلقہ اثر سے باہر نہ آ جاتا، اس لیے کہ مسلم فلسطین میں اسرائیل کی صہیونی ریاست کے قیام میں امریکہ کا ہاتھ تھا اور عرب اسے اپنے خلاف دشمنی پر محمول کرتے تھے، جبکہ دوسری طرف پاکستان کے لیے امریکہ کی امداد ناگزیر تھی۔ ان حالات میں ایک ہی صورت ہو سکتی تھی، یعنی باقی مسلم ممالک کو بھی امریکہ کے زیر اثر لایا جائے۔ لیکن ۱۹۷۷ء میں حکومت پر جنرل ضیاء الحق کے قابض ہونے تک اس جانب کوئی خاص پیش رفت نہ ہو سکی۔

مغرب کے ساتھ پاکستان کی فوجی وابستگی بین الاقوامی اسلامی یک جہتی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی، مگر پاکستان کا مخمصہ یہ تھا کہ امریکہ کی امداد اور سرپرستی کے بغیر وہ بھارتی خطرے کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی پاکستان کی کارکردگی قابل رشک نہ تھی۔ خاص طور پر بین الاسلامی ریاستی مشاورتی کونسل کے قیام کے ضمن میں وزیر خارجہ ظفر اللہ خان اور ان کی وزارت نے سفارتی سطح پر جو کوششیں کیں وہ نقائص سے پاک نہ تھیں۔ بعد میں حکومت پاکستان نے

کے عنوان سے ایک دستاویز شائع کر کے خود اس کا اعتراف کیا کہ" ایسی بے ڈھنگی...... حکمت عملی پاکستان کی سیاسی کمزوری کا نتیجہ تھی...... اگرچہ تجویز بہت عمدہ تھی مگر ایسے بلند و بالا منصوبے پر ابتدائی کام نہ ہونے کے برابر تھا"۔ چنانچہ جن ممالک کو کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی ان کے ساتھ گفت و شنید کے بغیر ہی تجویز کو عام کر دیا گیا اور اس طرح گویا پاکستان نے خود ہی اس تجویز کو ناکام بنا دیا۔ جو لوگ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے پر مامور تھے انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ مسلم ممالک کے سربراہانِ حکومت کی کانفرنس بھی اسی طرح کی کوئی شے ہوگی جو اس سے قبل دو مرتبہ کراچی میں منعقد ہو چکی ہیں۔

بعض مسلمان ممالک میں، جو اپنے آپ کو "بڑا" سمجھ رہے تھے، پاکستان کے بارے میں رقابت کا جذبہ پیدا ہونا قدرتی امر تھا۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان عالم اسلام کی قیادت سنبھالنے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ چنانچہ مصر کے شاہ فاروق نے اس تجویز پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ" پاکستان تو ایسا سمجھ رہا ہے گویا اسلام ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو پیدا ہوا ہے"۔ اسی طرح انڈونیشیا کے صدر سوئیکارنو کا کہنا تھا کہ" ہمیں پاکستان کی دوستی سے تو انکار نہیں مگر اُسے اپنا لیڈر نہیں بنا سکتے"۔ شاہ فاروق کے بارے میں بہت سے لوگوں کو یاد ہوگا کہ جولائی ۱۹۵۲ء میں تخت سے علیحدہ ہونے تک وہ اپنے آپ کو خلیفہ بننے کا حق دار خیال کرتے رہے تھے، لہٰذا اسلامی اتحاد کے لیے پاکستان کا پیش پیش رہنا انہیں ضرور کھٹکا ہوگا۔ پاکستانی سفارت کاروں کی یہ نااہلی تھی کہ وہ حالات کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

سعودی عرب کو بھی اپنی اہمیت کا کچھ کم احساس نہ تھا۔ مسلمانوں کے دو مقدس ترین شہر مکہ اور مدینہ اس کے کنٹرول میں تھے۔ پھر یہ کہ اس کے نزدیک صحیح اور اصل اسلام ان کے ہاں تھا، لہٰذا سعودی ویسے ہی باقی مسلمان ممالک کے مقابلے میں اپنے آپ کو اعلیٰ سمجھتے تھے۔ اس لیے قدرتی بات تھی کہ عمر رسیدہ ابن سعود نے عالم اسلام کی قیادت سنبھالنے کی پاکستان کی خواہش کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا ہوگا، (ان کا انتقال ۱۹۵۳ء میں ہوا تھا) اور ان کے بعد ان کے بیٹے سعود بن عبدالعزیز تخت نشین ہوئے تو انہوں نے ساری توجہ اپنی بادشاہت مضبوط بنانے پر مرکوز رکھی۔ لہٰذا اس سے بھی پاکستان کی کوشش میں رکاوٹ پیدا ہوئی ہوگی۔

<u>ایران</u>: ایک اور اہم ملک ایران کی صورت حال بھی ان دنوں نہایت پیچیدہ تھی۔ وزیر اعظم محمد

مصدق کی حکومت نے برٹش ایرانین آئل کمپنی قومی تحویل میں لے لی تھی اور ایران برطانیہ اور امریکہ کے ساتھ جھگڑے میں پھنسا ہوا تھا۔ ۱۹۵۲ء کا بیشتر عرصہ اسی جھگڑے کی نذر ہو گیا۔ ۱۹۵۳ء کے وسط میں مغربی طاقتوں کی شہ پر شاہ کے حق میں مظاہروں کے ذریعے مصدق کا تختہ الٹ دیا گیا' تب یہ جھگڑا ختم ہوا۔

ایران کی قومی حکومت نے شروع میں پاکستان کی تجویز کا خیر مقدم کیا مگر جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ چنانچہ پاکستان کے اعلان کے چار ماہ کے اندر ہی ایرانی مجلس کے سپیکر' آیت اللہ کاشانی جو ملک کی ایک اہم مذہبی شخصیت تھے' نے ایک اسلامی کانگریس بلانے کی ایرانی تجویز پیش کر دی جس میں پورے عالم اسلام کے راہنما شرکت کریں۔ صرف یہی نہیں کہ مجوزہ کانگریس ایران میں منعقد ہو بلکہ تہران کو اس کا مستقل ہیڈ کوارٹر قرار دیا جائے۔

پاکستان کی تجویز کی طرح اس ایرانی تجویز کے پیچھے بھی مسلم دنیا کی قیادت سنبھالنے کی خواہش جھلک رہی تھی' لہٰذا اس کا بھی وہی انجام ہوا جو پاکستان کی تجویز کا ہوا تھا۔ ایران نے اپنی تجویز کا اعلان کیا تو تین ماہ تک تو پاکستان اِدھر اُدھر دیکھتا رہا' بالآخر خواجہ ناظم الدین نے بادل نخواستہ آیت اللہ کاشانی کی تجویز کا خیر مقدم کیا۔

<u>مصر</u>: مصر کے جولائی ۱۹۵۲ء کے انقلاب نے اپنی اس صلاحیت کا اظہار شروع کر دیا تھا کہ وہ عرب دنیا کی مجموعی سیاست میں تبدیلی لا کر اتحادِ اسلامی کی کوششوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اتحادِ اسلامی کا مستقبل کم از کم اگلے تین برس کے لیے مصر کی اندرونی سیاست کے ساتھ منسلک ہو گیا' جہاں جلد ہی سیکولر اور دینی طاقتیں آپس میں گتھم گتھا ہو گئیں۔ کم و بیش یہی صورت حال ان دنوں پاکستان کی اندرونی سیاست میں بھی پیدا ہو چکی تھی۔

مصر میں ایک طرف فوجی حکمران ٹولہ تھا اور دوسری طرف وہاں کی اسلامی تحریک الاخوان المسلمون۔ اخوان نے شروع میں باغی افسروں کی حمایت کی تھی' لیکن جلد ہی انہیں احساس ہو گیا کہ فوجی قیادت سیکولر ہے' چنانچہ انقلاب کے دس ہفتوں کے اندر اخوان کے چوٹی کے راہنما شیخ حسن الھضیبی فوجی حکومت سے اختلاف کی بنا پر پارٹی قیادت سے مستعفی ہو گئے۔ تب تک فوجی قیادت کا سیکولر چہرہ کھل کر سامنے آ چکا تھا۔ اس محاذ آرائی میں ایک طرف جمال عبدالناصر اور ان

کے ساتھی آزاد افسر تھے اور دوسری طرف اخوان اور ان کے ساتھی آزاد اور فوجی افسر تھے۔ اخوان کا زیادہ انحصار انور السادات، راشد مہنا، کمال الدین حسین اور خاص طور پر عبدالمنعم عبدالرؤف جیسے آزاد افسران پر تھا جو ۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۰ء تک اخوان کے ساتھ وابستہ رہے تھے۔ اگرچہ جنوری ۱۹۵۳ء میں اخوان سمیت تمام سیاسی جماعتیں ختم کر دی گئی تھی، تاہم حکومت کے ساتھ اپنے روابط کی بنا پر یہ تحریک مارچ ۱۹۵۴ء تک اپنی سرگرمیاں جاری رکھے رہی، لیکن ۱۹۵۳ء میں حکومت کے ساتھ تعاون کے مسئلے پر اخوان کے اندر پھوٹ پڑ گئی، جس کی وجہ سے تین اہم راہنماؤں کو عارضی طور پر پارٹی سے نکال دیا گیا۔ ادھر حکمران طبقے میں بھی ناصر کے حامیوں اور صدر جنرل نجیب کے طرف دار فوجی افسروں کے درمیان ٹکراؤ میں اضافہ ہو رہا تھا جس میں اخوان کا جھکاؤ جنرل نجیب کی طرف تھا۔

پاکستان میں اسلامی تحریک قادیانی مسئلے پر حکومت کے مدمقابل آ کھڑی ہوئی تھی۔ سر محمد ظفر اللہ خان قادیانی تھے اور علماء ان کی برطرفی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ پنجاب میں شدید فسادات ہوئے جنہیں فوج کے ذریعے فرو کرنا پڑا۔ جماعت اسلامی کے امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو گرفتار کر کے ان کے خلاف (فوجی عدالت میں) مقدمہ چلایا گیا اور انہیں موت کی سزا سنائی گئی۔ اس دوران محلاتی سازش کے نتیجے میں محمد علی بوگرہ کو امریکہ سے لا کر اقتدار ان کے حوالے کر دیا گیا تا کہ وہ ظفر اللہ کی مخالفت کرنے والے "مذہبی جنونیوں" سے نپٹ سکیں۔

جنرل اسلامک کانگریس

مصر اور پاکستان میں اس افراتفری کے عالم میں اخوان نے ۱۹۵۳ء میں یروشلم میں ایک اسلامی کانفرنس کا اہتمام کر ڈالا۔ اخوان کے اس اقدام کی خصوصی اہمیت یہ تھی کہ اس نے عالم اسلام میں غیر سرکاری سطح پر اسلامی تحریکوں کے کردار کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی تھی۔ حکومتی سطح سے ہٹ کر اتحادِ اسلامی کے لیے یہ ایک اہم کوشش تھی اور یہ کوشش خلافت کے مسئلے کو چھیڑے بغیر کی گئی تھی۔

مصر کی حکومت میں ناصر ٹولہ اس کانفرنس سے چوکنا ہو گیا۔ یہی معاملہ پاکستان کا تھا، کیونکہ اخوان کی ہمدردیاں حکومت مخالف اسلامی تحریک کے ساتھ تھیں۔

اس کانفرنس میں شرکت کے لیے عراق، اردن، مراکو، پاکستان، تیونس اور ایران سے وفود

آئے۔ اس کے علاوہ چین، امریکہ، کا کیشیس اور شمالی عراق سے کردوں وغیرہ کے نمائندے بھی شریک ہوئے۔ کانگریس نے اپنا پرانا نام ''جنرل اسلامک کانگریس'' (جو ۱۹۳۱ء میں یروشلم میں ہونے والی کانگریس کو دیا گیا تھا) یعنی المؤتمر الاسلامی العام دوبارہ اختیار کر لیا۔ ایک اسلامی سیکرٹیریٹ کا قیام عمل میں لایا گیا اور پہلے سیکریٹری جنرل کے طور پر ڈاکٹر سید رمضان کا تقرر ہوا۔

مسئلہ فلسطین کے مسئلے پر کئی قراردادیں پاس ہوئیں۔ دو قراردادیں اسلامی بلاک (جس پر مئی ۱۹۵۲ء میں کراچی میں بحث ہوئی تھی) قائم کرنے کے بارے میں بھی منظور کی گئیں۔

کانگریس نے مشرق و مغرب کے بڑے بلاکوں سے الگ ایک اسلامی محاذ کے لیے دستور تیار کرنے کا مطالبہ کیا۔

یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ اللہ کے وعدے پر بھروسہ کرتے ہوئے اسلام کی سرحدوں کے تحفظ کی خاطر آگے بڑھا جائے۔

کانگریس کا فوری ردعمل مصر میں ظاہر ہوا جہاں اس کانگریس سے اخوان کے وقار میں اضافہ ہوا۔ کانگریس کے سیکریٹری جنرل کا تعلق مصر سے تھا۔ اسلامی معاملات میں مصر کو اپنا روایتی کردار ادا کرنے کا یہ اہم موقع مل رہا تھا۔ ناصر ٹولے کے لیے اخوان کی اہمیت کو نظر انداز کرنا آسان نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس سے بھی بڑی ایک اسلامی کانفرنس بلانے کا عندیہ ظاہر کیا جس میں مصر، پاکستان اور سعودی عرب کے راہنماؤں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے۔ اس کانفرنس کا مقصد مصر میں اخوان کے حق میں ابھرنے والے جذبات کو سرد کرنا اور حکومت مصر کو اسلام کا چمپئن ظاہر کرنا تھا۔

مصر کو فوری تائید پاکستان سے ملی جسے اندرونِ ملک اسلامی تحریک کے مقابلے میں مصر جیسے حالات کا سامنا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ پاکستانی عوام پر ابھی تک اسلامی بلاک قائم کرنے کی دھن سوار تھی جس سے پاکستان کی حکومت کو بھی اندرون ملک وہی فوائد حاصل ہوتے جن کی خواہش مصر کی حکومت کو تھی۔

نومبر ۱۹۵۳ء میں ملک عبدالعزیز ابن سعود کا انتقال ہو گیا اور ان کے بیٹے ولی عہد شہزادہ سعود بن عبدالعزیز تخت نشین ہوئے۔ سعود خود بھی اپنے ملک کو بین الاقوامی سیاست سے اس عدم توجہی اور کنارہ کشی سے باہر نکالنا چاہتے تھے جو ان کے والد کے دور میں طاری ہو گئی تھی۔ انہیں

تخت نشینی پر مبارکباد دینے کے لیے جو وفود آئے تھے ان میں ناصر کی سربراہی میں مصر کا وفد بھی شامل تھا۔ سعود نے خود ہی ناصر سے مجوزہ اسلامی کانفرنس کا ذکر چھیڑ دیا جس پر ظاہر ہے ناصر خوشی سے پھولے نہ سمائے ہوں گے۔

۱۵ فروری ۱۹۵۴ء کو جنرل نجیب نے استعفاء دے دیا تو ایک دم مصری حکومت کی مشکلات اپنی انتہا کو پہنچ گئیں۔ آزاد افسران ایک بحران سے دوچار ہو گئے' کیونکہ نجیب نے ان کے ساتھ پالیسی اور اختیارات کی تقسیم جیسے معاملات پر اختلافات کی بنا پر یہ استعفاء دیا تھا۔ تین روز بعد' ۲۸ فروری ۱۹۵۴ء کو اخوان کی زیر قیادت اٹھنے والی عوامی حمایت کی زوردار لہر نے نجیب کو دوبارہ عہدۂ صدارت پر لا کر بٹھا دیا' جس سے ناصر ٹولے پر یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ اخوان اور نجیب دونوں سے تصادم کے علاوہ چارہ نہیں۔ لہٰذا انہوں نے ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے مجوزہ اسلامی کانفرنس پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔

باب ہفتم

او آئی سی کے قیام سے پہلے کے حالات

(۱۹۵۴ء۔۱۹۶۹ء)

مکہ سربراہی اسلامی کانفرنس' اگست ۱۹۵۴ء

ناصر (جمال عبدالناصر) کی وہ کوشش بالآخر رنگ لائی جو وہ پاکستانی راہنماؤں اور سعود بن عبدالعزیز کے ساتھ جاری رکھے ہوئے تھے اور ۸ / اگست ۱۹۵۴ء کو مکہ میں سہ فریقی اسلامی سربراہی کانفرنس شروع ہوگئی۔ سعودی عرب کی نمائندگی شاہ سعود نے اپنے بھائی اور وزیراعظم فیصل بن عبدالعزیز کے ہمراہ خود کی۔ پاکستان سے سربراہ مملکت غلام محمد اور وزیراعظم محمد علی بوگرہ نے شرکت کی۔ البتہ مصر کی نمائندگی صدر' جنرل نجیب کی بجائے ناصر اور سادات نے کی جو بظاہر تعجب انگیز بات تھی۔ لیکن اس سے بین الاقوامی سطح پر یہ باور کرانا مقصود تھا کہ مصر میں اصل طاقت ناصر اور اس کے ساتھی ٹولے کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے علاوہ مصر کے اندر بھی اس اقدام سے رائے عامہ یقیناً متاثر ہوئی ہوگی۔

اس سربراہی کانفرنس میں چند دیگر ممالک اور بعض اہم شخصیات نے بھی شرکت کی تھی۔ شخصیات میں پرنس علی اور مراکو کے علال الفصی (Allal al Fassi) کا نام آتا ہے۔ دیگر ممالک تھے سوڈان' ہندوستان' سری لنکا' انڈونیشیا' شام اور عراق (شام اور عراق کی نمائندگی سعودی عرب میں مقیم ان کے سفیروں نے کی)۔

کانفرنس نے اپنا نام ''اسلامک کانگریس'' اختیار کر لیا اور جنرل سیکرٹیریٹ کے لیے جگہ کا انتخاب قاہرہ میں کیا جانا طے پایا۔ انور السادات پہلے سیکریٹری جنرل مقرر ہوئے۔ مصر نے ان کے لیے خاص طور پر کوشش کی تھی۔ یعنی یہ کہ سیکرٹیریٹ اور سیکریٹری جنرل کا تعلق مصر سے ہو' جو اُن کی تھڑدلی کا مظہر تو تھا ہی' سعودیوں کے احساسات سے بھی انہوں نے لاپرواہی کا مظاہرہ کیا۔ بہرحال اس سے سعودیوں کے جوش وخروش میں کمی آنا قدرتی بات تھی' لیکن ناصر پر چونکہ الاخوان

کو نیچا دکھانے کی دُھن سوار تھی اس لیے اس کے لیے یہ کامیابی بڑی اہم تھی کہ کانفرنس کا سیکرٹیریٹ قاہرہ میں قائم ہو رہا تھا اور سیکریٹری جنرل بھی مصر کا مقرر ہوا تھا۔

کانفرنس نے جو سیاسی فیصلے کیے ان میں اسلامی ممالک کے باہمی اتحاد کو مضبوط بنانے کا فیصلہ خاص طور پر قابلِ ذکر تھا۔ اس اتحاد کا اصل مقصد مشترک دشمن یعنی مقامی اسلامی تحریکوں کے خلاف ایک دوسرے کو مدد فراہم کرنا تھا۔

کانفرنس سے ناصر کے واپس مصر آنے تک اخوان کے خلاف میدان گرم ہو چکا تھا۔ چنانچہ ۲۶ راکتوبر ۱۹۵۴ء کو ناصر پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا جس کے چند گھنٹوں کے اندر اندر اخوان کے سرکردہ راہنماؤں کو گرفتار کرلیا گیا۔ عدالت نے حملے کا ذمہ دار اخوان کو قرار دیا جس کے نتیجے میں حکومت نے اس تحریک پر پابندی لگا دی۔ ادھر نجیب کو بھی قاتلانہ حملے کی اس سازش میں ملوث قرار دے کر ۱۴ رنومبر ۱۹۵۴ء کو عہدۂ صدارت سے برطرف کر کے گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ اخوان کے سات ارکان کو، جن میں اخوان کی سپریم کونسل کے عبدالقادر عودہ اور شیخ محمد الفرغالی جیسے اہم رکن شامل تھے، پھانسی دے دی گئی۔

اس وقت تک مختلف مسلمان ممالک میں اسلامی اتحاد کے لیے دو سطحوں پر کوشش ہو رہی تھی، ایک سرکاری سطح پر اور دوسری غیر سرکاری سطح پر۔ مصر میں اخوان کو کچل کر حکومت اسلام کی اجارہ دار بن گئی۔ نومبر ۱۹۵۴ء میں اخوان کے خلاف کارروائی سے قبل اسی ماہ حکومت نے مکہ کانفرنس کے فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے کا کام مکمل کرلیا تھا، تاکہ اخوان کے خلاف کارروائی پر کوئی ردِعمل ظاہر ہو تو حکومت کانگریس کو بطور ڈھال استعمال کر سکے۔

مصر کی حکومت اپنے اندرونی حریف پر کاری ضرب لگانے میں کامیاب ہو گئی تھی، لیکن بعض بیرونی طاقتیں اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھیں۔ چنانچہ فروری ۱۹۵۵ء میں امریکی سیکریٹری آف سٹیٹ جان فاسٹر ڈلس کی کوشش کے نتیجے میں مسلمان ممالک پاکستان، ایران، عراق اور ترکی کو برطانیہ کے ساتھ شامل کر کے ''بغداد پیکٹ'' کے نام سے ایک معاہدہ وجود میں لایا گیا۔ امریکہ اگرچہ خود اس معاہدے میں باقاعدہ شامل نہیں تھا لیکن ظاہر ہے اسے اس کی سرپرستی حاصل تھی، کیونکہ اسی کی کوششوں سے تو یہ وجود میں آیا تھا۔ مصر نے اسے اپنے خلاف ایک معاندانہ کارروائی قرار دیا اور خاص طور پر عراق کو ایک عرب ملک ہونے کی وجہ سے شدید تنقید کا نشانہ

بنایا۔ ادھر پاکستان کی اس معاہدے میں شمولیت ایک اسلامی بلاک کے قیام کے مقصد سے صریح انحراف تھا۔

نہر سویز کو قومی ملکیت میں لینے پر برطانیہ' فرانس اور اسرائیل کے مصر پر حملے کے دوران مصر اور پاکستان کے تعلقات مزید خراب ہو گئے' کیونکہ ''معاہدۂ بغداد'' کے مسلمان ممبر ممالک اس حملے پر صرف احتجاج کر کے خاموش بیٹھے رہے۔ ادھر ناصر راتوں رات عرب دنیا کے ہیرو بن گئے اور جب تک وہ برسر اقتدار رہے مصر اور پاکستان کے تعلقات میں بہتری نہ آ سکی۔ عربوں نے اتحاد اسلامی سے منہ موڑ کر عرب قوم پرستی کو اپنا لیا اور اس میں ایسے گم ہوئے کہ ۲۸/جون ۱۹۵۶ء کو دمشق میں ''جنرل اسلامک کانگریس'' کا دوسرا سالانہ اجلاس شروع ہوا تو عالم اسلام' خصوصاً عالم عرب نے ادھر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔

۱۹۵۷ء کے اوائل میں امریکی صدر آئزن ہاور نے اپنی نئی پالیسی کا اعلان کیا تو سعودی عرب نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی' جس سے سعودی عرب اور مصر کے تعلقات بھی جاتے رہے۔ بغداد پیکٹ کے ممبران بھی اس پالیسی کی حمایت کرنے والوں میں شامل تھے۔

۱۹۵۸ء میں امریکہ کی لبنان میں مداخلت سے نئی صورت حال پیدا ہو گئی۔ اسی سال عراق میں بادشاہت کا خاتمہ ہو گیا اور ایک جمہوری حکومت نے اس کی جگہ لے لی' جس نے آتے ہی معاہدۂ بغداد سے علیحدگی اختیار کر لی۔ سعودی عرب' ایران اور پاکستان کے لیے یہ تبدیلی اس لیے بھی تشویش کا باعث تھی کہ عراق کے انقلاب میں کمیونسٹوں کا ہاتھ تھا اور اس بات کا امکان تھا کہ نئی حکومت میں ان کا خاص اثر ہو گا۔

حالات نے اس تیزی سے پلٹا کھایا کہ عالم اسلام ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا اور اتحاد اسلامی کا مسئلہ پس پشت چلا گیا۔ مکہ میں ہونے والی سربراہی کانفرنس کا یہ انجام ہوا کہ قاہرہ میں جو صدر دفتر قائم کیا گیا تھا' سعودی عرب اور پاکستان نے اس سے اپنی لاتعلقی کا اظہار کر دیا۔ اگرچہ جنرل اسلامک کانگریس کا تیسرا سالانہ اجلاس جنوری ۱۹۶۰ء میں یروشلم میں منعقد ہوا اور ۱۹۶۲ء میں بغداد میں ورلڈ مسلم کانگریس کی میٹنگ بھی ہوئی مگر ان سے عالم اسلام میں کسی قسم کی ہلچل پیدا نہ ہو سکی۔

سعودی پیش قدمی

۱۹۶۴ء میں سعودی حکمران خاندان نے شاہ سعود بن عبدالعزیز کو اپنے بھائی فیصل بن

عبدالعزیز کے حق میں تخت چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ شاہ سعود کی شاہ خرچیوں کے سبب مالی حالت انتہائی تشویش ناک ہو گئی تھی۔ شاہ اور ان کے بیٹوں کا رہن سہن شاہی خاندان کے لیے رسوائی کا باعث ثابت ہو رہا تھا۔ لیکن دوسری اور زیادہ اہم وجہ یہ تھی کہ ناصر جس مغرب مخالف، سوشلزم پر مبنی عرب قوم پرستی کو ہوا دے رہے تھے اس کا سدِ باب ضروری تھا اور اس کا توڑ سوائے اسلام کے کوئی نہ تھا۔ شاہ فیصل چونکہ اپنی ذاتی زندگی میں نہایت سادہ اور نیک انسان تھے، لہٰذا اسلام کے علمبردار کے طور پر وہ بہترین کردار ادا کر سکتے تھے۔

شاہ فیصل کو صومالیہ کے ایک غیر متوقع اور خوش آئند فیصلے کے نتیجے میں جلد ہی اپنا منصوبہ پیش کرنے کا موقع مل گیا۔ دسمبر ۱۹۶۴ء کے اواخر میں امین الحسینی کی صدارت میں صومالیہ کے صدر مقام مغادیشو میں ورلڈ مسلم کانگریس کا اجلاس ہوا جس میں کئی قراردادیں منظور کی گئیں، لیکن ان میں ایک قرارداد ایسی تھی جس کا اعلان نہیں کیا گیا تھا۔ اس قرارداد میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ تمام مسلم سربراہانِ مملکت کی ایک سربراہ کانفرنس بلائی جائے۔ چنانچہ ایک وفد صومالیہ کے صدر عدن عبداللہ عثمان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے درخواست کی کہ مجوزہ سربراہی کانفرنس کے لیے سفارتی سرگرمیوں کی ذمہ داری وہ قبول کریں۔ عثمان نے یہ درخواست قبول کر لی۔

کانگریس نے اس کام کے لیے صومالی صدر کا انتخاب محض رواداری یا مروّت میں نہیں کیا تھا بلکہ عالم اسلام کے حالات کو مدنظر رکھ کر کیا تھا۔ چونکہ صومالیہ ابھی نیا نیا آزاد ہوا تھا اس لیے تمام مسلمان ممالک کے نزدیک اس کی حیثیت ایک غیر جانبدار ملک کی تھی۔ مغربی ممالک کے ساتھ اس کے تعلقات ابھی اس نوعیت کے نہیں تھے جو اس کے بارے میں کسی شک وشبہ کا باعث ہوتے۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ ایک افریقی ملک ہونے کی وجہ سے افریقی مسلمانوں کے لیے یہ ایک اعزاز تھا اور کوئی بھی عرب ملک اس کی مخالفت کر کے وہاں کے مسلمانوں کو ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

عثمان نے مسلمان سربراہانِ مملکت کے نام خطوط ارسال کیے اور انہیں مجوزہ اسلامی سربراہی کانفرنس کی ضرورت کا احساس دلایا۔ انہوں نے عقلمندی یہ کی کہ اس کے لیے خاموش حکمت عملی اختیار کی۔ مگر جواب میں انہیں صرف دو خطوط موصول ہوئے۔ ایک شاہ فیصل کا اور دوسرا صدر ایوب کا، ان دونوں نے مثبت ردعمل کا اظہار کیا تھا۔ صدر ناصر نے سرے سے جواب

ہی نہ دیا۔ اب چاہیے تو یہ تھا کہ کھلی سفارت کاری سے قبل مزید کچھ انتظار کرتے اور پھر سب سے پہلے اپنے پڑوسی افریقی ممالک کی حمایت حاصل کرتے تاکہ انہیں پورے افریقی مسلمانوں کی نمائندگی حاصل ہوتی' اس کے بعد سعودی عرب اور پاکستان کے ساتھ مل کر دوسرے مسلمان ممالک سے رابطہ کرتے اور انہیں اس کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کرتے۔ مگر انہوں نے پہلے مرحلے میں ہی مسلمان ممالک کا رویہ دیکھ کر ہمت ہار دی اور مزید کوشش ترک کر دی۔

ان کے بعد شاہ فیصل اس کام کو لے کر آگے آئے۔ انہوں نے مئی ۱۹۶۵ء کے حج کے موقع پر ورلڈ مسلم لیگ (رابطہ العالم الاسلامی) کی قانون ساز اسمبلی سے افتتاحی خطاب کے دوران صومالی صدر کی اسلامی سربراہی کانفرنس کی تجویز کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد اگلے قدم کے طور پر دسمبر ۱۹۶۵ء میں ایران کا دورہ کیا اور اسلامی سربراہی کانفرنس کے انعقاد کے لیے شاہ ایران کی تائید حاصل کی۔ ایران کے بعد چند ہی ماہ میں اردن' کویت' سوڈان' ترکی' پاکستان' مالی اور تیونس وغیرہ کے دورے کیے۔ لیکن مسئلہ یہ ہوا کہ ایران کے دورے کے اختتام پر جو اعلامیہ جاری کیا گیا تھا اس کی وجہ سے ان کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ناصر نے اس اعلامیے کو بنیاد بنا کر اس تجویز کو سختی سے رد کر دیا' جس کے بعد اس تجویز کا ناکام ہونا یقینی ہو گیا۔

ناصر پہلے تو انتظار کرتے رہے' کوئی دو ماہ بعد شام اور مصر کے ''ادغام'' کی سالگرہ تھی' وہاں خطابت کے جوہر دکھائے۔ اسلامی سربراہی کانفرنس کو ''اسلامی پیکٹ'' کا نام دے کر اس پر بڑے زوردار حملے کیے۔ ناصر نے کہا کہ یہ تجویز ''معاہدۂ بغداد'' کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش ہے' مصر ایسی کسی بھی سازش کا منہ توڑ جواب دے گا جس کا مقصد اسلام کے نام پر رجعت پسند سامراج کو تقویت فراہم کرنا ہو۔ انہوں نے کہا کہ اسلامی پیکٹ دراصل آزادی کی تحریکوں اور سماجی ترقی کے خلاف سامراجی طاقتوں کے ساتھ گٹھ جوڑ ہے' جس کا مقصد عرب عوام پر اپنا تسلط قائم رکھنا ہے اور جو مسلمان ممالک غیر وابستہ رہنا چاہتے ہیں انہیں سامراجی شکنجے میں جکڑنا ہے۔ ناصر کی حیثیت ویسے بھی گھر کے بھیدی کی تھی' اس لیے اسے سعودی عزائم کو سمجھنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہو سکتا تھا۔

جس ماہ صدر ناصر نے یہ تقریر کی تھی اسی ماہ عراق کے صدر عبدالسلام عارف قاہرہ گئے اور صدر ناصر کے ساتھ بات چیت کرنے کے بعد بیان دیا: ''عرب ممالک پر کسی قسم کا بیرونی اتحاد

ٹھونسنے کی کوشش کا وہی انجام ہوگا جو معاہدۂ بغداد کا ہوا ہے۔ اس لیے کہ اب مسلمانوں کو خوش نما نعروں سے دھوکہ نہیں دیا جا سکتا۔"

روسی وزیر اعظم الیکسی **کوسیجن** نے مئی ۱۹۶۶ء میں قاہرہ کا دورہ کیا تو انہوں نے بھی یہی راگ الاپا اور کہا کہ "نام نہاد اسلامی اتحاد مسلمان عوام کے مفاد میں نہیں۔"

اس میں شک نہیں کہ سعودی کوشش کا اصل محرک قوم پرستی، جمہوریت اور لادین سوشلزم پر مبنی ناصری مہم کا سیاسی سطح پر مقابلہ کرنا ہی تھا، اس لیے ناصر کا یہ کہنا غلط نہ تھا کہ سعودی کوشش کا مقصد اس کی آزاد خارجہ پالیسی کو ناکام بنانا ہے۔

سعودی کوشش کی ناکامی کے اور بھی کئی اسباب تھے۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ سعودی عرب کو صومالیہ کی بجائے اس کام میں خود آگے آنا ہی نہیں چاہیے تھا، کیونکہ مصر کے ساتھ اس کے تعلقات پہلے ہی سے خراب تھے، جن کی وجہ سے مصر اور دوسرے سوشلسٹ عرب ممالک کی طرف سے ان کی مخالفت ہونا متوقع تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ شاہ ایران کے ساتھ مشترکہ اعلامیہ سے اپنی کوششوں کا آغاز کرنا کوئی عقلمندی نہیں تھی، کیونکہ ایران ایک شیعہ ملک تھا جبکہ باقی سارا عالم اسلام سُنّی تھا۔ مزید برآں ایران نے اسرائیل کو تسلیم کر کے اس کے ساتھ اقتصادی تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ آخری وجہ یہ تھی کہ ایران "سینٹو" (CENTO) کے فوجی معاہدے کے حوالے سے مغرب کا حلیف ملک تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر ایران اور عرب کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل تھی۔ یوں ایران کا انتخاب بدشگونی کا باعث بنا۔

تیسری غلطی یہ ہوئی کہ کھلی سفارت کاری پر عمل کر کے شاہ فیصل نے ناصر اور ان کے حامیوں کے خلاف عرب عوام کی حمایت حاصل کرنا چاہی، جو از خود اسلامی سربراہی کانفرنس کو ایک متنازعہ امر بنانا تھا، کیونکہ اس طرح مسلم ممالک کے لیے شاہ فیصل اور صدر ناصر، دونوں میں سے کسی ایک کی طرف داری کرنا ضروری ہو گیا۔ چنانچہ کئی ممالک نے اس تفرقہ میں پڑنے سے گریز کیا۔ پاکستان نے بھی، جو اتحاد اسلامی کی کوششوں میں ہمیشہ پیش پیش رہا تھا، اس موقع پر پیچھے رہنا مناسب سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اپریل ۱۹۶۶ء کے حج کے موقع پر اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد کرنے کی شاہ فیصل کی تمام تر کوشش اور بیانات کے باوجود یہ کانفرنس منعقد نہ ہو پائی، جس سے بین الاقوامی سطح پر یہ تاثر ابھرا کہ اسلامی سربراہی کانفرنس کی اصل تجویز ہی ناکام ہو گئی ہے۔

جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کا اقدام

اسلامی سربراہ کانفرنس کے لیے صومالیہ کے صدر نے جو خطوط ارسال کیے تھے ان کے چند ماہ بعد انڈونیشیا کی کوشش سے ایفروایشیائی مسلمانوں کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی۔ یہ کانفرنس مارچ ۱۹۶۵ء میں جکارتہ میں ہوئی اور صدر سوئیکارنو نے افتتاحی اجلاس سے خطاب کیا' جس میں انہوں نے ایک ترقی پسند اسلام پر زور دیا' ایک ایسا اسلام جو مسلمانوں کو اپنی آزادی کے تحفظ اور دنیاوی زندگی بہتر بنانے میں مدد فراہم کرے۔ ناصر کی طرح سوئیکارنو بھی ایک پرجوش قوم پرست' مغرب مخالف اور سامراج دشمن شخص تھا۔ ''ترقی پسند'' اسلام کو فروغ دلانے کے علاوہ اس کانفرنس کے اہم مقاصد میں ایک مقصد ملائیشیا کے ساتھ انڈونیشیا کے جھگڑے میں بین الاقوامی طور پر انڈونیشیا کے لیے مسلمانوں کی حمایت حاصل کرنا تھا۔ کانفرنس میں ہندوستان' پاکستان اور چین کے مسلمانوں نے شرکت کی۔ ایران' سعودی عرب اور ترکی اِس سے الگ رہے۔

کانفرنس میں چین کی وہ قرارداد منظور نہ ہو سکی جس میں امریکہ اور برطانیہ کو ''سامراجی طاقتیں'' قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اسی طرح انڈونیشیا کی وہ قرارداد بھی رد ہو گئی جس میں ملائیشیا کی یہ کہہ کر مذمت کرنے کو کہا گیا تھا کہ وہ ''برطانیہ کا آلۂ کار'' ہے۔ انڈونیشیا کی سرپرستی میں قائم شمالی بورنائی کی جلاوطن حکومت کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا گیا۔ کانفرنس کے اختتامی اجلاس میں ''انڈونیشیا کے خلاف برطانوی سامراج کی جارحیت اور جنوب مشرقی ایشیا میں مداخلت'' کی پرزور مذمت کی گئی۔ کانفرنس نے سامراجی اور استعماری نظام کے خلاف جدّ وجہد نیز مسلمان عوام کے ''حق خود اختیاری'' کی حمایت کا اعلان کیا۔ یہ بھی طے پایا کہ کانفرنس کی حیثیت ایک مستقل ادارے کی ہوگی اور اس کا صدر دفتر جکارتہ میں ہوگا۔ اس طرح ۱۹۶۵ء تک عالم اسلام میں غیر حکومتی سطح پر تین اسلامی تنظیمیں وجود میں آ چکی تھیں: دی ورلڈ مسلم کانگریس کراچی' دی ورلڈ مسلم لیگ مکہ' اور دی ایفروایشین مسلم وپیپلز کانفرنس جکارتہ۔

چھ روزہ جنگ

جون ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل چھ روزہ جنگ میں عربوں کو شکست فاش ہوئی۔ مصر کے محاذ پر پوری غزہ کی پٹی اور سینائی' شام میں گولان کی پہاڑیاں اور اردن میں یروشلم اور پورا مغربی کنارہ اسرائیل کے قبضے میں جا چکا تھا۔ جہاں تک زیر بحث موضوع کا تعلق ہے' اس جنگ کا فوری

اثر یہ ہوا کہ مصر اور دیگر عرب سوشلسٹ ممالک کو سعودی عرب اور کویت کے ساتھ مفاہمت پر مجبور ہونا پڑا۔ چنانچہ ۱۹۶۸ء میں عرب لیگ کے توسط سے خرطوم میں عرب سربراہی کانفرنس منعقد ہوئی' جس میں سعودی عرب اور کویت نے مصر' شام اور اردن کو مالی امداد فراہم کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ نیز ناصر اور فیصل کے درمیان یمن میں فوراً جنگ بند کرنے پر سمجھوتہ ہو گیا۔

وسیع تر تناظر میں دیکھا جائے تو اس جنگ کے نتیجے میں مصر اور سوشلسٹ عرب ممالک کے مقابلے میں سعودی عرب کی پوزیشن خاصی مضبوط ہو گئی اور اس کی اتحادِ اسلامی کی تجویز کا فوری خیر مقدم نہ سہی' سعودی امداد کے محتاج ممالک کے لیے اس کی کھلی مخالفت کرنا بھی ممکن نہ رہا۔ ادھر یروشلم کا مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جانا ایک غیر معمولی واقعہ تھا' جس کی وجہ سے مسلمان حکمران یہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کی آپس کی ناچاقی سے وہاں کی اسلامی تحریکوں کو سر اٹھانے کا موقع مل جائے گا۔ یروشلم پر اسرائیل کے قبضے سے پہلے سیکولر عرب قوم پرستی اور سوشلزم کے زیر اثر اکثر عرب ممالک مشرق وسطیٰ میں جاری محاذ آرائی کو عرب اسرائیل یا عرب صیہونی تصادم کا نام دیتے تھے۔ لیکن اب اس تصور کو برقرار رکھنا مشکل ہو گیا تھا' کیونکہ مشرق وسطیٰ کی بجائے اب یہ مسلمانوں کے ایک مقدس شہر پر یہودیوں کے غاصبانہ قبضے کا مسئلہ بن گیا تھا۔

پاکستان وہ واحد ملک تھا جو یروشلم کو اردن کا حصہ تسلیم کرتا تھا' اس لیے اسے آگے آنے کا یہ اچھا موقع مل رہا تھا جس کی بنا پر اقوام متحدہ میں اس مسئلے پر وہ مرکزی کردار ادا کر سکتا تھا۔ ادھر جنگ میں شرمناک شکست کے بعد مسلمان ممالک نے بھی آپس کے تعاون کے لیے سنجیدگی سے صلاح مشورے شروع کر دیے تھے' جن کے نتیجے میں جلد ہی اقوام متحدہ کے اندر ایک اسلامی بلاک تشکیل پا گیا۔ پاکستان نے اقوام متحدہ میں مسلمان ممالک کے درمیان پیدا ہونے والے اس باہمی تعاون کو بھی بھرپور طور پر استعمال کیا اور جنرل اسمبلی کے ۱۹۶۷ء کے اجلاس میں یروشلم کی حیثیت کے بارے میں دو قراردادیں منظور کروا لیں۔ جنرل اسمبلی میں کامیابی کے بعد ۱۹۶۸ء میں سلامتی کونسل میں یہ مسئلہ اٹھایا گیا۔ پاکستان جو اُس وقت سلامتی کونسل کا رکن تھا' سفارتی سرگرمیوں میں پیش پیش رہا۔ اس نے اردن کی مدد سے سلامتی کونسل میں بھی بڑی مہارت اور چابک دستی سے یروشلم کا مقدمہ لڑا اور وہاں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی۔ (اردن کو ووٹ کا حق دیے بغیر صرف بحث میں حصہ لینے کی دعوت دی گئی تھی۔) سلامتی کونسل میں کئی قراردادوں کے

ذریعے اس اسرائیلی کارروائی کو چیلنج کیا گیا تھا جو وہ یروشلم کی حیثیت تبدیل کرنے کی خاطر عمل میں لا رہا تھا۔ یوں چھ روزہ جنگ میں اسرائیل کی فتح نے اتحاد اسلامی کی کوششوں میں نئے سرے سے جان ڈال دی۔

ملائیشیا کی پیشکش

جنوری ۱۹۶۸ء میں ملائیشیا کے وزیر اعظم نے مسلمان ممالک کی دولت مشترکہ قائم کرنے کے بارے میں غور کرنے کے لیے ایک اسلامی کانفرنس بلانے کی تجویز پیش کی۔ وزیر اعظم تنکو عبدالرحمن نے بڑی مہارت سے اپنی تجویز کو آگے بڑھایا۔ انہوں نے اپنے وزیر اراضی و معدنیات' حاجی عبدالرحمن یعقوب کو صلاح مشورے کے لیے مسلمان ممالک کے دورے پر بھیجا۔ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ میں عربوں کی شکست کے باعث ان کی تجویز کی کہیں بھی مخالفت سامنے نہ آئی۔ انہوں نے مزید احتیاط برتی اور سربراہ کانفرنس پر زور دینے سے گریز کیا۔ البتہ یہ مطالبہ ضرور کیا کہ کانفرنس میں وزارتی سطح سے کم نمائندگی نہ ہو۔ ان کی کوشش کامیاب ہوئی اور اپریل ۱۹۶۹ء میں کوالالمپور میں اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی' جس کی کامیابی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ یو۔ اے۔ آر (یونائیٹڈ عرب ریپبلک) کی نمائندگی ایک حکومتی وزیر نے کی' لیکن ناصر حکومت کی نمائندگی کرنے کے لیے الگ سے ایک وزیر موجود تھے۔ اس سے اس تبدیلی کا اظہار بھی ہوتا ہے جو اسلامی اتحاد اور اسلام کے بارے میں مصریوں کے نقطۂ نگاہ میں آئی تھی۔

کانفرنس نے دو اہم قراردادیں منظور کیں اور یہ دونوں قراردادیں پاکستان نے پیش کی تھیں۔ پہلی قرارداد میں کہا گیا تھا کہ اس کے بعد ایک اور کانفرنس بلائی جائے جو مسلمان ممالک کو درپیش سیاسی مسائل' خاص طور پر یروشلم اور مسجد اقصیٰ کو آزاد کرانے کے مسئلے پر بحث کرے۔ دوسری قرارداد میں مسلمان ممالک کے باہمی تجارتی تعلقات کو زیر بحث لانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

کانفرنس کے دوران اس وقت صورت حال خاصی پیچیدہ ہو گئی جب فلسطین کی تحریک آزادی ''الفتح'' کے وفد نے کارروائی میں شریک ہونے پر اصرار کیا' جسے آرگنائزنگ کمیٹی نے فنی وجوہ کی بنا پر قبول کرنے سے انکار کر دیا' کیونکہ کانفرنس میں صرف حکومتی نمائندوں کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ تاہم ملائیشیا کی حکومت نے ''الفتح'' کو کوالالمپور میں اپنا دفتر کھولنے کی اجازت دے کر معاملہ رفع دفع کرا دیا۔

۱۹۵۴ء کی مکہ کانفرنس کے بعد حکومتی سطح پر یہ پہلی اسلامی کانفرنس تھی۔ اس کی کامیابی سے یہ امکان پیدا ہو گیا تھا کہ اگلی کانفرنس ۱۹۶۹ء کے اواخر یا ۱۹۷۰ء کے اوائل میں منعقد ہو جائے گی۔ یہ امکان اس لیے بھی قرین قیاس تھا کہ اس میں بحث کے لیے فلسطین اور مسجد اقصیٰ کی آزادی جیسا انتہائی اہم مسئلہ رکھا گیا تھا۔ ۱۹۶۹ء کے وسط تک یہ بات یقینی نظر آنے لگی تھی کہ اسلامی اتحاد کا تصور ناممکن العمل نہیں رہا۔ چنانچہ چار ہی ماہ بعد ''دی آرگنائزیشن آف دی اسلامک کانفرنس'' (او۔آئی۔سی) کا قیام عمل میں آ گیا' جس سے کام کی رفتار میں مزید اضافہ ہوا۔

❁❁❁

باب ہشتم

رباط میں اسلامی سربراہی کانفرنس (ستمبر ۱۹۶۹ء)

اور آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس کا قیام

تعارف

آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس (OIC) کا قیام پہلی مرتبہ مراکش کے شہر رباط میں ستمبر ۱۹۶۹ء میں عمل میں آیا۔ ذیل میں ان اسباب و واقعات کا تذکرہ کیا جارہا ہے جو اس کانفرنس کے انعقاد کا موجب بنے۔ نیز کانفرنس میں ہونے والی کارروائی، اس کے اعلامیے اور قراردادوں کا ایک جائزہ بھی پیش کیا جارہا ہے۔

مسجد اقصیٰ میں آگ لگنے کا واقعہ

اسرائیل کے زیر تسلط یروشلم میں واقع مسجد اقصیٰ میں ۱۲/اگست ۱۹۶۹ء کو آگ لگنے کا واقعہ پیش آیا۔ گو چند ہی گھنٹوں کے اندر آگ پر قابو پا کر اسے بجھا دیا گیا مگر اس وقت تک آگ سے مسجد اقصیٰ کو خاصا نقصان پہنچ چکا تھا اور وہ مشہور منبر جل کر راکھ ہو چکا تھا جو سلطان صلاح الدین ایوبی نے بارہویں صدی میں مسجد کے لیے تحفہ دیا تھا۔

اس واقعہ سے پورے عالم اسلام میں غم و غصے کی ایک شدید لہر دوڑ گئی یہاں تک کہ تمام مسلمان ممالک نے فوراً سلامتی کونسل کو احتجاجی خطوط اور تار روانہ کیے۔ اس کے دو اسباب تھے، پہلا یہ کہ الاقصیٰ مسلمانوں کی تین متبرک اور مقدس مساجد میں تیسری مسجد تھی اور اس میں اس وقت آگ لگی جب یہ اسرائیل کے قبضے میں تھی۔ دوسرا زیادہ تشویش ناک سبب یہ تھا کہ مسلمانوں کو پہلے ہی اندیشہ لاحق تھا کہ یہودی مسجد کو گرا کر اس جگہ پر دوبارہ ہیکل سلیمانی (جو ۷۰ء میں تباہ کردیا گیا تھا) تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ ان خدشات کو خود اسرائیلیوں کے بیانات اور بین الاقوامی پریس کی رپورٹوں سے بھی ہوا ملی تھی۔

اسرائیلی حکومت نے ایک بیان جاری کیا جس میں اس نے آگ لگنے کے واقعے پر گہرے

افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بڑی ڈھٹائی سے اس کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا اور آگ لگنے کا سبب معلوم کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کر دیا۔

عرب لیگ کا اجلاس

۲۱ راگست کو اردن کے شاہ حسین نے تمام عرب ممالک کے سربراہان مملکت کو ایک پیغام بھیجا جس میں فوری طور پر ایک عرب سربراہ کانفرنس بلانے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ شاہ حسین کی تجویز پر غور کرنے کے لیے عرب لیگ کے ممبر ممالک کے وزرائے خارجہ ۲۵ راگست کو قاہرہ میں جمع ہوئے۔ جن ممالک نے اپنے نمائندے وہاں بھیجے ان میں الجزائر' عراق' اردن' کویت' لبنان' لیبیا' مراکش' سعودی عرب' سوڈان' شام' تیونس' یونائیٹڈ عرب ری پبلک اور جنوبی یمن شامل تھے۔ ان کے علاوہ تنظیم آزادئ فلسطین (پی ایل او) کا نمائندہ بھی شریک ہوا۔

اردن کی عرب سربراہ کانفرنس کی تجویز کی مصر اور پی ایل او نے خاص طور پر حمایت کی' تاہم سعودی عرب نے اس کی بجائے ایک اسلامی سربراہ کانفرنس بلانے کی تجویز سامنے رکھی۔ سعودی عرب کی تجویز کے حق میں دو عوامل تھے۔ ایک یہ کہ مسجد اقصیٰ تمام مسلمانوں کے لیے برابر کے درجے میں مقدس اور اہم تھی اور دوسرے یہ کہ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں شکست کھانے والے عرب ممالک کو سعودی عرب اچھی خاصی مالی امداد دے رہا تھا اور اس وجہ سے عربوں کی سیاست میں سعودی عرب کو نمایاں اثر و رسوخ حاصل ہو چکا تھا۔ چنانچہ وزرائے خارجہ نے اسلامی سربراہ کانفرنس بلانے کی اہمیت تسلیم کر لی اور سعودی عرب اور مراکش کو یہ ذمہ داری سونپی کہ تجویز کو آگے بڑھائیں۔

اسلامی سربراہ کانفرنس کی تیاریاں

عرب لیگ کے وزرائے خارجہ کی جانب سے سعودی عرب اور مراکش کو اسلامی سربراہ کانفرنس بلانے کا اختیار ملنے کے بعد دونوں ممالک کے وزرائے خارجہ نے جدہ میں ستمبر کے پہلے ہفتے میں ملاقات کی اور سات ممالک کی ایک کمیٹی مقرر کی جس کے سپرد کانفرنس کے انتظامات کیے گئے۔ سعودی عرب اور مراکش کے علاوہ پانچ مزید ممالک کمیٹی میں شامل کیے گئے' یعنی پاکستان' ایران' ملائیشیا' صومالیہ اور نائیجیریا۔ یہ ساتوں ممالک یا تو خود اسلامی اتحاد اور اسلامی سربراہی کانفرنس کی کوششوں میں پیش پیش رہ چکے تھے یا اس کے لیے جو تجاویز پیش کی گئی تھیں ان کی تائید

کر چکے تھے۔

کانفرنس کے انتظامات کے لیے قائم کمیٹی کی ۸-۹/ ستمبر کو رباط (مراکش) میں میٹنگ ہوئی۔ کمیٹی کے رکن ممالک کی نمائندگی ان کے وزرائے خارجہ نے کی اُس میں دو موضوع زیر بحث آئے۔ کانفرنس کا ایجنڈا اور کن ممالک کو شرکت کی دعوت دی جائے۔ دونوں کے بارے میں جو فیصلے کیے گئے انہوں نے مزید مسائل کو جنم دیا۔ جس ایجنڈے پر اتفاق رائے ہوا وہ تھا: ''مسجد اقصیٰ اور یروشلم کے مقدس شہر کے سوال پر بحث کرنا''۔ کسی ملک کو دعوت دینے کے لیے جو معیار مقرر کیا گیا تھا وہ یہ تھا: ''ان ممالک کو شرکت کی دعوت دی جائے جن میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۵۰ فیصد سے زائد ہو'' یا ''اس ملک کا سرکاری مذہب اسلام ہو''۔ ہندوستان چونکہ ان دونوں میں سے ایک شرط بھی پوری نہیں کرتا تھا لہٰذا اس کے بارے میں فیصلہ کیا گیا کہ اسے صرف مبصر کے طور پر شرکت کی دعوت دی جائے۔

پہلا فیصلہ ایجنڈے کے بارے میں تھا۔ اس پر صفِ اوّل کی عرب ریاستیں اور سوڈان غیر مطمئن تھے۔ چنانچہ عراق' شام' مصر اور سوڈان نے یہ مہم شروع کر دی کہ سربراہ کانفرنس سے پہلے وزرائے خارجہ کانفرنس کی میٹنگ ہونی چاہیے (سربراہی کانفرنس ۲۲/ ستمبر کو منعقد ہونا قرار پا چکی تھی) ان کے پیش نظر یہ تھا کہ وزرائے خارجہ کی میٹنگ کے ایجنڈے میں مسجد اقصیٰ اور یروشلم کے مسئلے کے ساتھ مشرقِ وسطیٰ کے پورے مسئلے کو شامل کرایا جائے۔

کانفرنس کی تیاری کرنے پر مامور کمیٹی میں شامل ممالک نے سربراہ کانفرنس سے قبل وزرائے خارجہ کی میٹنگ کی کوششوں کی اس بنا پر مخالفت کی کہ اگر ایجنڈے کو بڑھا کر اس میں مشرقِ وسطیٰ کے پورے مسئلے کو شامل کیا گیا تو ایران' ترکی اور دیگر مسلمان ممالک' جو اسرائیل کو تسلیم کر کے اس کے ساتھ سفارتی اور تجارتی تعلقات قائم کر چکے ہیں' سربراہ کانفرنس میں شریک نہیں ہوں گے۔ تاہم اگر انہوں نے شرکت کی بھی تو کانفرنس مسئلے کا حل پیش کرنے کی بجائے آپس کی پھوٹ کا شکار ہو جائے گی اور اسلامی اتحاد کی جانب پیش رفت نہیں ہو گی۔

پاکستان نے وزرائے خارجہ کی میٹنگ کی تجویز کی ایک اور وجہ سے بھی مخالفت کی۔ پاکستان نے اب تک بھارت کی کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ حاصل کرنے کی کوششوں کا بڑی سختی سے مقابلہ کیا تھا اور وہ اپنی اس کوشش میں اس لیے کامیاب رہا تھا کہ کانفرنس کی تیاری کرنے

والی کمیٹی میں شامل ممالک پاکستان کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اختیار کیے ہوئے تھے' لیکن وزرائے خارجہ کی میٹنگ میں اس بات کا قوی امکان تھا کہ بھارت کی درخواست منظور کر لی جائے' کیونکہ بھارت دعوت نامہ حاصل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔

بھارت نے سربراہ کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ نہ ملنے پر ملائیشیا سے رسمی طور پر احتجاج بھی کیا' جس پر وزیراعظم تنکو عبدالرحمن نے ترت جواب دیا کہ بھارت کون سا مسلمان ملک ہے؟ بھارت کے سرکاری ترجمان نے جواب دیا کہ متعدد ممالک نے (نام لیے بغیر ملائیشیا کو ان میں شامل کرتے ہوئے) اسے شرکت کی یقین دہانی کرائی تھی' لیکن اب پاکستان کے دباؤ میں آ کر وہ کنی کترا رہے ہیں۔

مصر آخری لمحے تک وزرائے خارجہ کی میٹنگ پر اڑا رہا۔ مصر' سوڈان' ایران' عراق اور شام نے تجویز پیش کی کہ وزرائے خارجہ کی میٹنگ نیویارک میں ہو سکتی ہے' جہاں ۱۶ ستمبر کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس منعقد ہو رہا ہے۔ عراق اور شام نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر میٹنگ نہ ہوئی تو وہ سربراہ کانفرنس کا بائیکاٹ کریں گے۔ ادھر مصر کا کہنا تھا کہ اگر اس کی یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی تو صدر ناصر کانفرنس میں شریک نہیں ہوں گے۔

جب ۲۱ ستمبر تک وزرائے خارجہ کی میٹنگ نہ ہوئی تو شام اور عراق نے (اسلامی سربراہی کانفرنس میں) شرکت سے صاف انکار کر دیا۔ البتہ مصر کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ صدر ناصر کے اچانک ''بیمار'' ہو جانے کے باعث اس کا وفد انور السادات کی سربراہی میں شرکت کرے گا۔

سربراہ کانفرنس

پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس رباط (مراکش) میں ۲۲ ستمبر ۱۹۶۹ء کو شروع ہوئی۔ مسجد اقصیٰ میں آگ لگے ایک ماہ ایک دن ہوا تھا۔ ۲۵ ممالک کانفرنس میں شرکت کر رہے تھے' جن میں افغانستان' الجزائر' چاڈ' گنی' انڈونیشیا' کویت' لبنان' لیبیا' ملائیشیا' مالی' موریطانیہ' مراکش' ترکی' متحدہ عرب امارات اور یمن شامل تھے۔ جن ممالک نے شرکت سے معذرت کر لی تھی ان میں نائیجیریا' عراق اور شام شامل تھے۔ غالباً کل ۳۶ ممالک کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اس لحاظ سے ۸ مزید ممالک بھی شریک نہیں ہوئے تھے۔

ان سربراہانِ مملکت وحکومت نے کانفرنس میں شرکت کی: شاہ ایران' سعودی عرب کے شاہ

فیصل، اردن کے شاہ حسین، کویت کے امیر، الجزائر کے صدر بومدین، پاکستان کے صدر یحییٰ خان، موریطانیہ کے مختار اولد دادہ، صومالیہ کے شرمک (Sharmake)، یمن کے اریانی، افغانستان کے وزیر اعظم نور احمد اعتمادی، جب کہ ملائیشیا کے تنکو عبدالرحمان پترا اور ترکی کے وزیر خارجہ احسان صابری کگلیا نگل نے اپنے ملک کی نمائندگی کی۔ مصر اور تیونس کے سربراہ بیمار پڑ جانے کی وجہ سے شرکت نہ کر سکے۔ ترکی کے وزیر اعظم سلیمان ڈیمرل نے بتا دیا تھا کہ ترکی میں پارلیمنٹ کے انتخابات کی وجہ سے نہ وہ شریک ہو سکتے ہیں نہ صدر۔

لیبیا میں ایک بغاوت کے نتیجے میں یکم ستمبر کو شاہ ادریس کا تختہ الٹ دیا گیا تھا، نئی حکومت ناصر کے حامیوں پر مشتمل تھی۔ چنانچہ اس نے ناصر کی پیروی کرتے ہوئے نچلی سطح کا ایک وفد شرکت کے لیے بھیج دیا۔ مراکش کے شاہ حسن کی صدارت میں کانفرنس کا پہلا اجلاس مختصر طور پر ۲۲ ستمبر کی شام کو ہوا اور تین میں سے دو مسائل کا اجلاس کو فوری سامنا کرنا پڑا، جن کے بارے میں بعض ممالک نے خواہش ظاہر کی کہ سب سے پہلے ان کو نپٹا لیا جائے۔

اوّلاً الجزائر نے پی ایل او کی مبصر کے طور پر شرکت چاہی۔ ایران اور ترکی نے، جن کے اسرائیل کے ساتھ مراسم قائم تھے، الجزائر کی تجویز کی مخالفت کی، تاہم کانفرنس نے اس مخالفت کے علی الرغم الجزائر کی تجویز منظور کر لی۔

ثانیاً کانفرنس میں بھارت کو شرکت کی دعوت دینے کا مسئلہ اُٹھایا گیا۔ شاہ فیصل نے اس کی مخالفت کی اور بیشتر وفود نے شاہ فیصل کی تائید کر دی۔ لیکن پاکستان کی طرف سے مخالفت نہ ہونے پر کانفرنس کے صدر شاہ حسن نے بھارت کو شرکت کی دعوت دے دی۔

بھارت، پاکستان

اگلی صبح جب یہ خبر پاکستان پہنچی تو اس پر حیرت کا اظہار کیا گیا۔ اس وقت تک ۲۳ ستمبر کی صبح کا اجلاس شروع تھا اور صدر یحییٰ کو ملک میں ہونے والے احتجاج کی خبریں مل رہی تھیں۔ پیپلز پارٹی کے سربراہ ذوالفقار علی بھٹو نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "میرے نزدیک تو اس دعوت کا مطلب پاکستان کے نظریے کی ہی نفی ہے۔ یہ فیصلہ ہمارے لیے انتہائی نقصان دہ اور تباہ کن ہے۔"

پاکستان میں اس لیے بھی صورتِ حال پیچیدہ ہو گئی کہ ۱۶/ ستمبر سے بھارت میں مسلم کش

فسادات کی خبریں شائع ہو رہی تھیں۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ ۱۷/ستمبر کو احمد آباد میں مسلمانوں کے خلاف جو فسادات شروع ہوئے ہیں وہ بھارت کو کانفرنس میں شرکت کی دعوت نہ دینے کی پاداش میں ہوئے ہیں۔ بھارت نے فسادات کے لیے پاکستانی حکومت کو قصوروار ٹھہرایا۔

احمد آباد کے فسادات سخت تشویش کا باعث تھے۔ اگرچہ ہفتے کے دوران مرنے والوں کی تعداد کے بارے میں متضاد خبریں آ رہی تھیں (رائٹر کی ایک رپورٹ میں یہ تعداد ایک ہزار بتائی گئی تھی) لیکن اس میں شک نہیں کہ بھارت کی تاریخ میں یہ بدترین مسلم کش فسادات تھے۔ پاکستانی اخبارات میں ایک ہفتے سے متواتر قتل و غارت گری، لوٹ مار، مسجدوں پر حملوں اور عورتوں کی بے حرمتی کے واقعات شائع ہو رہے تھے۔ جب لوگوں کو یہ خبر ملی کہ یحییٰ خان مسلم سربراہ کانفرنس میں بھارت کی شرکت پر راضی ہو گئے ہیں تو ان کے اس فیصلے کی جس شدت سے فوراً مذمت کی گئی اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ رباط سے واپسی پر یحییٰ خان کو سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑے گا۔

۲۳/ستمبر بعد دوپہر رباط میں مقیم ہندوستانی سفیر گوربچن سنگھ نے سربراہ کانفرنس میں بھارت کی شرکت کا دعوت نامہ وصول کیا۔ مراکش کے وزیر خارجہ نے کانفرنس کے ترجمان کی حیثیت سے اعلان کیا کہ بھارتی وفد شرکت کے لیے روانہ ہو چکا ہے اور جب تک وہ یہاں نہیں پہنچتا بھارت کی نمائندگی اس کے سفیر گوربچن سنگھ کریں گے۔ یہ اعلان ۲۳ ستمبر کو کانفرنس کے صبح کے اجلاس کے بعد دوپہر کے کھانے کے وقفے کے دوران کیا گیا تھا۔ لہٰذا یہ اعلان پاکستانی وفد کے علم میں ہونا قدرتی بات تھی۔

۲۳ ستمبر کو بعد دوپہر جب اس روز کا دوسرا اجلاس رباط کے ہلٹن ہوٹل میں شروع ہوا تو گوربچن سنگھ کو ہندوستانی وفد کے سربراہ کے طور پر وہاں جگہ دی گئی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر عبدالعلیم جنہیں ہندوستانی وفد کا رکن نامزد کیا گیا تھا' کانفرنس کے شروع ہونے سے پہلے ہی رباط میں موجود تھے' لہٰذا وہ بھی کانفرنس روم میں موجود تھے۔

یحییٰ خان اور پاکستانی وفد پہلے وقفے تک اجلاس میں بیٹھے رہے۔ اس کے بعد یحییٰ خان ہال سے باہر چلے گئے اور واپس آنے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ میں نے بھارتی مسلمانوں کے نمائندہ وفد کی شرکت پر رضامندی ظاہر کی تھی۔ ایک سکھ گوربچن سنگھ مسلمانوں کا نمائندہ نہیں ہو

سکتا' بلکہ جو وفد شرکت کر رہا ہے وہ بھارت کی حکومت کا نامزد کردہ ہے (یعنی اس کی حیثیت حکومتی وفد کی ہے) لہٰذا وہ اس کے ساتھ ایک میز پر نہیں بیٹھ سکتے۔ چنانچہ وہ اپنی قیام گاہ پر واپس آ کر مقیم ہو گئے' جس سے ایک بہت بڑا سفارتی اور سیاسی بحران پیدا ہونے کی نوبت آ گئی۔

متعدد سربراہانِ مملکت نے ان کی قیام گاہ پر جا کر انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔ ان میں شاہ فیصل' شاہ حسین اور شاہ ایران شامل تھے' لیکن یحییٰ خان اپنی ضد پر اڑے رہے۔ وہ صرف اسی صورت میں کانفرنس میں واپس آنے پر راضی تھے جب بھارتی وفد کو وہاں سے نکالا جائے۔ حکومتی سربراہان نے ہندوستانی سفیر سے بھی تبادلہ خیال کیا کہ کیا وہ یہ پسند کریں گے کہ کانفرنس میں ہندوستان میں ہونے والے فسادات کے بارے میں بات کی جائے؟ ہندوستانی سفیر نے احترام کے ساتھ اس کی اجازت دینے سے معذرت کر لی۔ اس نے کہا یہ ہندوستان کا اندرونی مسئلہ ہے۔ اسے اگلے اجلاس سے رضا کارانہ طور پر باہر رہنے کے لیے کہا گیا مگر اس نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ درحقیقت ہندوستانی سفیر جس مشکل صورتِ حال سے دوچار تھے اس سے نکلنے کا کوئی راستہ تھا بھی نہیں۔

بالآخر حکومتی اور ریاستی سربراہان آپس میں اس فیصلے پر پہنچے کہ ہندوستانی وفد کو کانفرنس میں شریک ہونے سے روک دیا جائے۔ اگلی صبح ۲۴ ستمبر کے اجلاس میں یحییٰ خان شامل تھے۔ بجائے اس کے کہ وہ واپس جا کر اپنے خلاف مظاہروں کا سامنا کرتے' ہندوستان کو کانفرنس سے نکلوا کر ہیرو بن گئے۔ لیکن ہندوستان کو اس طرح کھلے بندوں بے عزت کر کے اس نے یہ جواز فراہم کر دیا کہ بھارت بھی بدلے میں اسی طرح پاکستان کو رسوا کر سکے۔ ہندوستان کو بدلہ لینے کے لیے زیادہ عرصہ انتظار نہ کرنا پڑا' دو سال بعد ہی اس نے پاکستان کو دولخت کر دیا۔

گوربچن سنگھ کو بتا دیا گیا تھا کہ کانفرنس کے آئندہ منعقد ہونے والے اجلاسوں میں اسے شریک ہونے کی اجازت نہیں ہو گی' لیکن اس کے باوجود وہ ۲۴ ستمبر کی صبح رباط ہلٹن میں پہنچ گیا۔ مراکش کے پروٹوکول آفیسر نے اسے اندر جانے سے روک دیا' جس پر اُس نے ہوٹل کی لابی میں ایک پریس کانفرنس منعقد کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اسے سختی سے ہوٹل سے چلے جانے کا کہا گیا اور بتایا گیا کہ ہوٹل کے احاطے میں اس کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔

چند گھنٹے بعد ہندوستانی وفد کے سربراہ' وزیر صنعت و ترقی فخر الدین علی احمد رباط کے

ایئرپورٹ پر پہنچے۔انہوں نے کانفرنس میں جانے کا کہا مگر مراکش کے پروٹوکول آفیسرز انہیں ان کی قیام گاہ پر لے گئے اور اس وقت تک وہاں رکھا گیا جب تک اس روز کی کانفرنس کا اجلاس ختم نہیں ہو گیا۔

۲۴ ستمبر کو رات گئے کانفرنس کا اختتامی اجلاس منعقد ہوا اور رباط کے اعلامیہ اور قرارداد کی منظوری پر کانفرنس اپنے اختتام کو پہنچی۔

رباط اعلامیہ

رباط اعلامیہ دو حصوں پر مشتمل تھا' ایک کا تعلق عالم اسلام کے اتحاد سے تھا اور دوسرے کا تعلق یروشلم' مقبوضہ عرب علاقوں اور مسئلہ فلسطین سے۔ اتحادِ عالم اسلامی کے بارے میں اعلامیہ میں کہا گیا کہ ''حکومتیں مل کر صلاح مشورہ کریں گی تاکہ معاشی' سائنسی' ثقافتی اور مذہبی میدانوں میں اسلام کی ابدی راہنمائی کے سلسلے میں آپس کے تعاون اور امداد کو فروغ دیا جائے''۔(لفظ ''سیاسی'' خاص طور پر شامل نہیں کیا گیا تھا)۔ اعلامیہ میں مزید کہا گیا تھا کہ ''تمام حکومتوں نے آپس کے جھگڑے پُرامن طور پر حل کرنے کے عزم کا اظہار کیا ہے''۔ کانفرنس نے جو قرارداد منظور کی تھی وہ اعلامیہ کے اسی حصے سے متعلق تھی اور اسے اتحاد اسلامی کی جانب عملی قدم قرار دیا جاسکتا تھا۔ قرارداد میں بیان کیا گیا تھا کہ کانفرنس کے فیصلے کے مطابق ۶ ماہ کے اندر (یعنی مارچ ۷۰ء تک) وزرائے خارجہ کی ایک اسلامی کانفرنس بلائی جائے گی۔ اس کا ایجنڈا دو (۲) امور پر مشتمل ہوگا۔

۱) شریک ممالک کی رباط اسلامی سربراہ کانفرنس کے اعلامیہ میں مذکور قرارداد کے بین الاقوامی سطح پر عمل درآمد کے نتائج کا جائزہ لینا۔

۲) ایک مستقل سیکرٹیریٹ کے قیام پر غور کرنا جس کے ذمے کانفرنس میں شامل حکومتوں کے ساتھ رابطہ قائم کرنا اور ان کی سرگرمیوں میں ربط پیدا کرنا ہو۔ اتحاد اسلامی کے حامی ممالک نے ایک اسلامی تنظیم کے قیام کے لیے شام' عراق اور مصر کے صدر ناصر کی کانفرنس سے غیر حاضری سے بھرپور فائدہ اُٹھایا۔ ان ممالک نے ایک اسلامی بلاک یا فوجی وابستگی کے اسلامی معاہدہ کا ذکر نہ کر کے اپنی تجویز کو مزید قابل قبول بنانے کی کوشش کی تھی۔ چھ ماہ میں وزرائے خارجہ کی میٹنگ بلا کر ایک اسلامی سیکرٹیریٹ قائم کرنے کے

فیصلے سے اس خواہش کا اظہار ہوتا تھا کہ اسلامی ممالک کی کوئی نہ کوئی تنظیم ہونی چاہیے۔ سیکرٹیریٹ قائم کرنے کا یہی ایک مقصد تھا۔

رباط اعلامیہ کے ذریعے سربراہ کانفرنس میں شریک ممالک کو "باہمی تنازعات پُرامن طور پر طے کرنے کا" ذمہ دار قرار دے کر درحقیقت سعودی عرب کی تائید کی گئی تھی جس کا شروع دِن سے یہ بنیادی مقصد رہا تھا۔ اس مقصد کو ۱۹۷۲ء میں باقاعدہ اسلامی کانفرنس کے چارٹر میں شامل کر کے مزید تقویت فراہم کر دی گئی۔

رباط اعلامیہ' مشرق وسطیٰ' یروشلم اور فلسطین

رباط اعلامیہ کے دوسرے حصے میں اسلامی ممالک نے مشرق وسطیٰ کے مسئلے کے تین مختلف پہلوؤں پر اپنی پوزیشن واضح کی۔ سب سے پہلے انہوں نے مسجد اقصیٰ میں آتش زدگی کے بارے میں اپنا موقف بیان کیا' تاہم آگ کی ذمہ داری اسرائیل پر ڈالنے سے گریز کیا۔ ایسا اس پاکستانی قرارداد کو مدِنظر رکھتے ہوئے کیا گیا جو ۱۶ ستمبر ۱۹۶۹ء کو سلامتی کونسل نے منظور کی تھی۔ لیکن مقدس مقامات کی تباہی اور بے حرمتی کی دیگر کارروائیوں کو' جن میں آتش زدگی کا واقعہ شامل تھا' القدس پر اسرائیل کے فوجی قبضے کا شاخسانہ قرار دیا۔ مزید کہا گیا کہ اس شہر پر قبضے سے "مقدس مقامات مسلسل خطرے سے دوچار ہیں اور ان کا احترام ممکن نہیں۔ ان مقامات تک بلا روک ٹوک رسائی کے لیے شہر کی جون ۱۹۶۷ء سے پہلے کی حیثیت' جو تیرہ سو سال سے چلی آ رہی ہے' بحال کی جائے۔" چنانچہ ان ممالک نے اعلان کیا کہ "ان کی حکومتیں فلسطین کے مسئلے کا ایسا کوئی حل منظور نہیں کریں گی جس میں یروشلم کی جون ۱۹۶۷ء سے پہلے کی حیثیت کو نظر انداز کیا گیا ہو۔"

یروشلم کے بارے میں اعلامیہ کے تین اہم نکات تھے۔ پہلے نکتے میں یروشلم سے اسرائیل کے انخلاء کا مطالبہ تھا' جس سے ایک طرف مقدس مقامات کا تقدس برقرار رہے گا' اور دوسری طرف ان مقامات تک آزادانہ رسائی کو یقینی بنایا جا سکے گا۔ آتش زدگی کے واقعہ کا یہ موزوں جواب تھا کہ یروشلم کا جو بھی مستقبل طے ہو' اسرائیل کو اس شہر سے نکل جانا چاہیے' اسرائیلی قبضہ مقدس مقامات کی سلامتی' تحفظ اور تقدس کے منافی ہے۔

دوسرا اہم نکتہ یہ تھا کہ اس شہر کی جون ۱۹۶۷ء سے پہلے والی حیثیت بحال کی جائے۔ مگر کون سی حیثیت؟ کیا اس سے مراد اردن کی حاکمیت اور کنٹرول تھا؟ اردن نے یہاں پر ۱۹۴۸ء میں

برطانوی انخلاء کے بعد قبضہ کیا تھا اور کشیدگی میں کمی واقع ہونے پر ۱۹۴۹ء میں یروشلم کو اپنی بادشاہت میں شامل کر لیا تھا' لیکن اسے صرف دو ممالک' برطانیہ اور پاکستان نے تسلیم کیا تھا۔ گویا دیگر تمام مسلمان ممالک کے نزدیک اس کی حیثیت اردن کے ایک مقبوضہ شہر کی تھی۔ اگر یہ بات تھی تو سوال پیدا ہوتا تھا کہ اصل حاکم شہر کون تھا؟ اس کا جواب قرارداد میں موجود تھا یعنی ''تیرہ سو سالہ تاریخ کی رو سے جو حیثیت معیّن ہوتی ہے''۔ اس کی صرف ایک ہی تشریح ممکن تھی کہ مسلمان ممالک کے نزدیک یروشلم پر حکومت کا حق عربوں اور مسلمانوں کو حاصل ہے' مگر وہ کسی ایک اسلامی ملک کو یہ حق دینے سے قاصر تھے۔ اسلامی ممالک اس حق کی نمایاں خصوصیات تو بیان کر سکتے تھے' لیکن یہ حق کسے حاصل ہے' اس کی نشاندہی کرنا ممکن نہ تھا۔

اس مشکل کا پیش آنا قدرتی بات تھی' اس لیے کہ لفظ ''حاکمیت'' (Sovereignty) جدید سیاسی اصطلاح ہے اور اس کا تعلق لامحالہ جدید قومی ریاست کے تصور سے جڑتا ہے۔ اس نظام کی رو سے کسی شہر کو ایک ملک کی حکومت کے تحت ہونا چاہیے۔ اگر یہ نہیں تو پھر ایک ہی راستہ ہو سکتا تھا کہ اس شہر کو بین الاقوامی حیثیت دے دی جائے یا ویٹی کن کی طرز پر ایک نیا ملک بنایا جائے جو اس شہر پر مشتمل ہو۔

اگر اسلامی ممالک اسلام کی رو سے یروشلم کی حاکمیت کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے تو شاید زیادہ دقت پیش آتی' اس لیے کہ اس کا ایک ہی جواب ہوتا کہ اصل حاکمیت تو اللہ تعالیٰ کی ہے اور اللہ تعالیٰ کے نائب کے طور پر پوری مسلمان امت حاکم ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یروشلم پر اپنی نیابت کے لیے کسی کو خاص طور پر مقرر نہیں فرمایا ہے۔ قرآن وحدیث میں کہیں یہ درج نہیں کہ یروشلم پر حکومت کرنا مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے۔ خواہ نظری طور پر سہی' اگر یہ دلیل پیش کی جاتی کہ یروشلم پر حکمرانی پوری امت کی ہے تو یروشلم سے زیادہ یہ بات سعودی عرب میں مکہ اور مدینہ پر لازم آتی۔ بہر حال یروشلم پر حکمرانی کے لیے اسلام سے مدد حاصل کرنا ممکن نہ تھا۔

یروشلم سے متعلق قرارداد کا تیسرا اہم پہلو یہ تھا کہ اس کی جون ۱۹۶۷ء سے پہلے والی حیثیت بحال کرنے کے علاوہ دیگر تمام حل مسترد کر دیے گئے تھے۔ اس طرح مسلمان ممالک نے یروشلم پر حاکمیت کے ضمن میں کسی غیر عرب اور غیر اسلامی ملک یا ممالک کے ساتھ شرکت کو خارج از امکان قرار دے دیا تھا۔ یہ مسئلہ ۱۹۱۷ء میں یروشلم کے سلطنت عثمانیہ کے ہاتھوں سے نکل کر

اتحادی طاقتوں کے ہاتھوں میں چلے جانے کے بعد سے لیگ آف نیشنز اور اقوام متحدہ کی توجہ کا مرکز چلا آ رہا تھا۔ دونوں جگہ اس شہر پر اثر ورسوخ قائم کرنے کے لیے مغربی عیسائی حکومتوں کے درمیان رسہ کشی ہوتی رہی تھی۔ برطانیہ، فرانس، یونان، سپین، کیتھولک پوپ وغیرہ سب یروشلم پر کنٹرول میں شرکت کے لیے کوشاں تھے۔ لہٰذا رباط اعلامیہ کی زد اسرائیل کے علاوہ عیسائی دنیا اور مغربی (عیسائی) ممالک پر بھی پڑتی تھی، کیونکہ یروشلم پر تسلط قائم کرنے میں اسلام کو نہ عیسائیت کی شرکت گوارا تھی نہ یہودیت کی۔

مسلم ممالک نے اپنے فیصلے میں ۱۹۳۱ء کی اقصیٰ اسلامی کانفرنس کا اختیار کردہ موقف برقرار رکھا۔ اب ایک نظر اس موقف پر ڈالتے ہیں۔

رباط سربراہ کانفرنس کے موقع پر رومن کیتھولک چرچ کے سربراہ پوپ پال نے مراکش کے شاہ حسن کے نام یہ پیغام بھیجا:

> ''دنیا میں شاید ہی کسی خطۂ زمین پر خدا کی خدائی اتنی قابل رحم ہوگی جتنی اس مبارک سرزمین فلسطین میں ہے، جس کے ساتھ ایسی یادیں اور تقدس وابستہ ہے جو ایک خدا کو ماننے والے تینوں بڑے مذاہب کے لیے اہم ہیں...... اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ ان تینوں مذاہب کے پیروکاروں کو جو ایک ہی خدا کے ماننے والے ہیں، مقدس مقامات، خصوصاً یروشلم میں واقع مقامات کی حیثیت کے بارے میں ایک متفقہ لائحہ عمل اختیار کرنے پر راضی ہو جانا چاہیے۔''

اس سے قبل فلسطین میں واقع مقدس مقامات کے بارے میں پوپ اکثر یہ اپیل کرتے آئے تھے کہ ان کی دیکھ بھال کا اہتمام بین الاقوامی طور پر ہونا چاہیے، لیکن یہاں ان کا پیغام یہ تھا:

> ''اپنے اپنے عقیدے پر عمل پیرا رہتے ہوئے مذہب کو اتحاد کا ذریعہ بنانا چاہیے تاکہ سیاسی اور فوجی محاذ آرائیوں کی بجائے امن و آشتی کو فروغ حاصل ہو۔''

پوپ کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یروشلم کے مسئلے کا حل تینوں مذاہب یعنی اسلام، عیسائیت اور یہودیت کے ماننے والوں کو مل کر تلاش کرنا چاہیے۔ یہ حل باہر سے ٹھونسنے کی بجائے مقامی حالات پر منحصر ہو۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ بات تسلیم کی جانی چاہیے کہ اس شہر کے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا جتنا حق مسلمانوں کو حاصل ہے اتنا ہی عیسائیوں اور یہودیوں کو بھی حاصل ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے بہت پہلے یروشلم عیسائیوں کا مقدس شہر تھا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے یہ یہودیوں کا مقدس شہر تھا۔ اس لحاظ سے مسلمان سب سے آخر میں آتے ہیں۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ پوپ نے جو تجویز پیش کی تھی اس میں قابلِ اعتراض بات کیا تھی؟ قابلِ اعتراض دو باتیں تھیں: پہلا اعتراض یہ تھا کہ گزشتہ تیرہ سو سال سے یہ شہر مسلمانوں کے کنٹرول میں رہا تھا۔ اتنے طویل عرصے تک ان کے کنٹرول میں رہنے کا مطلب یہ تھا کہ آئندہ بھی انہی کے کنٹرول میں رہنا چاہیے۔

یہ دلیل تین لحاظ سے کمزور تھی۔ اوّلاً یہ کہ یہ ایک مقدس مقام تھا' کوئی عام علاقہ نہیں' لہٰذا مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ حکمرانی کے بعد بھی یہ عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے اسی طرح مقدس تھا۔ ثانیاً یہ کہ مسلمانوں نے اسے عیسائیوں سے فتح کر کے حاصل کیا تھا' لہٰذا مسلمانوں نے فوجی طاقت کے ذریعے اس پر اپنا تسلط قائم کیا تھا۔ اس کے بعد عیسائیوں نے اسے واپس لے لیا اور صلیبی دور میں ۷۰ سال ان کے پاس رہا۔ مسلمانوں نے دوبارہ اسے فتح کیا۔ چنانچہ ایسا کبھی بھی نہیں ہوا تھا کہ مسلمانوں نے عیسائیوں اور یہودیوں سے صلح صفائی کے ذریعے یروشلم کا کنٹرول حاصل کیا ہو۔ ثالثاً یہ کہ اسلام کی رو سے دارالاسلام وہ علاقہ ہوتا ہے جس پر مسلمانوں کا تسلط ہو۔ اگر دارالاسلام کا کچھ حصہ کسی وقت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جائے تو ان کی یہ دینی ذمہ داری ہے کہ وہ علاقہ دشمن سے واپس لینے کی جدوجہد کریں' لیکن اگر ان میں اتنی طاقت نہ ہو تو اسلام میں ایسی کوئی شق موجود نہیں ہے جو ایسے علاقے کے بارے میں انہیں مصالحانہ رویہ اختیار کرنے سے روکتی ہو۔

پوپ نے جو تجویز پیش کی تھی اس پر دوسرا اعتراض یہ تھا کہ یہودیت اور عیسائیت تو اصلاً اسلام ہی تھے مگر ان کے پیروؤں نے اس سے انحراف کر لیا۔ اب حقیقی اسلام وہ ہے جس کو مسلمان مانتے ہیں۔ عیسائیوں اور یہودیوں نے اسلام سے انحراف کر کے یروشلم پر تسلط کا حق کھو دیا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کی اطاعت قبول کرنے اور جزیہ ادا کرنے کے علاوہ باقی ایک ہی حل رہ جاتا ہے کہ یہودی اور عیسائی اسلام قبول کر کے نبی اکرم ﷺ کی اُمت میں شامل ہو جائیں۔ راقم پہلے ہی اس بارے میں عرض کر چکا ہے کہ قرآن کی رو سے تو عیسائیوں اور یہودیوں میں بھی وہ لوگ ہیں جو مؤمن شمار ہوتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اسلام کی رو سے یہ کہیں لازم نہیں ٹھہرایا گیا کہ یروشلم سے یہودیوں اور عیسائیوں کو ہٹا کر مسلمانوں کی حکومت قائم کی جائے۔ نبی کریم ﷺ کے حکم کے مطابق جزیرہ نمائے عرب کو عیسائیوں، یہودیوں اور تمام غیر مسلموں کے تسلط اور اثر و رسوخ سے پاک رکھنا لازم ہے۔ مزید برآں مکہ اور مدینہ کے حرم کے علاقے میں کوئی غیر مسلم داخل نہیں ہو سکتا، لیکن یروشلم کے حرم کے علاقے کے بارے میں ایسا کوئی حکم نہیں۔

اسلام کے گہرے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مسلمانوں کو اس کی اجازت تھی کہ یروشلم کو ایک اللہ کے ماننے والوں کا شہر قرار دیے جانے پر مذاکرات کر سکیں۔ پوپ نے اپنے پیغام میں اس جانب اشارہ بھی کیا تھا مگر رباط کانفرنس میں اس جانب کوئی توجہ نہ دی گئی۔ اگر ایسا ہو جاتا تو عالمی یہودیوں کے درمیان خود بخود پھوٹ پڑ جاتی، کیونکہ یہودیوں کے بعض طبقے یروشلم کے بارے میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے ساتھ شرکت کے خلاف تھے، جبکہ ان کا اصل مذہبی طبقہ اس کا خیر مقدم کرتا۔

مشرقِ وسطیٰ

صف اوّل کی عرب حکومتیں سربراہ کانفرنس میں مشرق وسطیٰ کے مسئلے کو بحیثیت مجموعی زیر بحث لانے میں کامیاب ہو گئیں۔ دوسرے یا تیسرے روز کے صبح کے اجلاس میں ایجنڈے کو بڑھا کر "تمام مقبوضہ عرب علاقوں سے اسرائیلی فوجوں کے انخلاء" کے موضوع پر بحث کو شامل کر لیا گیا، جس کے نتیجے میں کانفرنس کے سامنے دو ہی راستے کھلے تھے۔ یا تو عمومی طور پر ایک کمزور پوزیشن اختیار کرتے ہوئے تمام شریک ممالک کے اتفاقِ رائے کا اظہار کرے، یا مخصوص طور پر مضبوط پوزیشن اختیار کرے، جس پر بعض ممالک کی طرف سے مخالفت ہوتی۔ اس صورت میں مثال کے طور پر تمام شریک ممالک سے مطالبہ کیا جاتا کہ وہ اسرائیل کو تسلیم نہ کریں اور اس کے ساتھ سفارتی اور تجارتی تعلقات قائم کرنے سے گریز کریں۔

کانفرنس نے ان ممالک کو ناراض نہ کرنے کے خیال سے جن کے اسرائیل کے ساتھ سیاسی اور تجارتی تعلقات قائم تھے، اپنے آپ کو اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل درآمد کرانے کے مطالبے تک محدود رکھا۔ کانفرنس نے بڑی طاقتوں سے خاص طور پر اپیل کی کہ وہ "۱۹۶۷ء کی جنگ میں عرب علاقوں پر قابض ہونے والی اسرائیلی فوجوں کی جلد واپسی کی اپنی کوششیں

تیز تر کریں۔"

صفِ اوّل کی عرب ریاستیں اور ان کے حمایتی نسبتاً ایک سخت موقف اختیار کیے جانے کی توقع رکھتے تھے۔ چنانچہ شمالی اور جنوبی یمن دونوں نے بطور احتجاج مارچ ۱۹۷۰ء کی مجوزہ وزرائے خارجہ کی اسلامی کانفرنس کے حق میں ووٹ دینے سے گریز کیا اور شمالی یمن کے صدر عبدالرحمن اریانی نے اعلامیے پر کھلے عام اپنی مایوسی کا اظہار کر دیا:

> "یمن اس لیے رباط سربراہ کانفرنس میں شریک ہوا تھا کہ اس سے عربوں کے حقوق اور فلسطین کی جدوجہد میں مدد ملے گی، لیکن مجھے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ اقوام متحدہ کی گھسی پٹی قراردادوں کے تذکرے کے سوا یہاں کچھ بھی نہیں کیا گیا۔ رباط کانفرنس کی قراردادوں سے میرے ملک کو اسلامی دنیا کے حوالے سے کسی قسم کی کوئی تحریک نہیں ملی۔"

مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں کانفرنس کی قرارداد کے دفاع میں بعض ممالک نے یہ دلیل پیش کی کہ ابھی اس پر مزید مفاہمت ہونی چاہیے تاکہ مشرقِ وسطیٰ کے مسئلے پر عربوں کی توقعات پر بھی پورا اترا جاسکے اور ایران اور ترکی جیسے ممالک کے اعتراضات کو نظر انداز کر کے اسلامی اتحاد کا نازک کام بھی پس پشت نہ ڈالا جائے۔ لہٰذا کانفرنس میں جس قدر مفاہمت حاصل ہوئی اگر وہ بھی نہ ہوتی تو اسلامی اتحاد کا معاملہ یہیں ٹھپ ہو جاتا۔ چنانچہ اس وقت سب سے اہم مسئلہ اسلامی اتحاد کو آگے بڑھانے کا تھا۔

فلسطین

اعلامیہ کا ایک پیرا فلسطینیوں کے لیے مخصوص تھا: "فلسطین کا المیہ اس بات کا متقاضی ہے کہ فلسطینی عوام کے غصب شدہ حقوق کی بحالی اور قومی آزادی کی جدوجہد میں ان کی بھرپور مدد کی جائے۔"

تنظیم آزادیٔ فلسطین (پی ایل او) کا، جسے بطور مبصر کانفرنس میں شرکت کی اجازت دی گئی تھی، سرے سے کوئی تذکرہ نہیں تھا۔ اس قسم کی زبان استعمال کرنے سے مکمل اعراض برتا گیا جس کے ذریعے پی ایل او کی حمایت کا پہلو نمایاں ہوتا اور اس کی مالی امداد اور اس کے ساتھ تعاون کی ترغیب ملتی۔

فلسطینیوں کے "غصب شدہ حقوق" اور "قومی آزادی کی تحریک" کا بھی سرسری طور پر ذکر کیا گیا تھا۔ یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا کہ اسرائیلی ریاست کا قیام فلسطینیوں کے حقوق کی

بحالی اور قومی آزادی کی راہ میں اصل رکاوٹ ہے۔ جو عبارت اعلامیہ میں شامل تھی اس سے پی ایل او اور ممبر ممالک اپنی مرضی کا مطلب نکالنے میں آزاد تھے۔

یہ بات خاص طور سے نوٹ کرنے کی ہے کہ مسلمان ممالک نے ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے قیام کے بعد سے کہیں بھی اس کے قیام کے حق کا انکار نہیں کیا تھا۔ فلسطینیوں کی قومی آزادی کی تحریک کی حمایت کرنے سے خود بخود اسرائیلی ریاست کے قیام کی نفی نہیں ہوتی۔ اس لحاظ سے یہ اعلامیہ اور زیادہ اہمیت کا حامل تھا کہ اصل بات کہنے سے گریز کیا گیا تھا۔ یہ بات بھی خاص طور پر دلچسپی کا باعث ہو گی کہ مسلمانوں کے ایک امت کے تصور کی جانب کوئی ہلکا پھلکا اشارہ بھی نہیں کیا گیا تھا جس سے اسرائیل کے متعلق موقف اختیار کرنے میں کوئی راہنمائی ملنے کا امکان ہوتا، کیونکہ اس صورت میں فلسطین کو دارالحرب قرار دیے بغیر چارہ نہ ہوتا۔

بھارت اور سربراہ کانفرنس

ہندوستان کو سربراہ کانفرنس میں شرکت کی دعوت دینے اور پھر پاکستان کے بائیکاٹ کرنے پر اس کے کانفرنس سے نکالے جانے کے نمایاں اثرات مرتب ہوئے۔ کانفرنس کا جو سرکاری اعلامیہ جاری کیا گیا تھا، اس میں کانفرنس میں ہندوستانی مسلمانوں کی شرکت کا ذکر بھی تھا۔ ۲۵ ستمبر کو جب یہ اعلامیہ جاری کیا گیا اسی شام بھارتی وفد کے سربراہ فخر الدین علی احمد نے ایک بیان جاری کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ”اعلامیہ کا یہ حصہ حقائق پر مبنی نہیں، کیونکہ ہندوستان کے کسی نمائندے نے کانفرنس میں شرکت نہیں کی۔“ انہوں نے مزید کہا کہ شرکت کی دعوت ”حکومت ہند“ کو دی گئی تھی۔

کانفرنس کے ترجمان نے پریس کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ ہندوستان اختتامی اجلاس میں بالفعل موجود نہیں تھا۔ احمد نے اس بیان کا یہ کہہ کر پول کھول دیا کہ اس سے یہ تاثر مل سکتا ہے کہ ”ہمارا وفد اپنی خوشی سے شریک نہیں ہوا“ لیکن انہوں نے کہا کہ ”حقیقت یہ نہیں، اصل میں ہمارے وفد کو کل (۲۴ ستمبر) یا آج (۲۵ ستمبر) نہ تو اجلاس کے وقت اور نہ ہی پروگرام کی کوئی اطلاع دی گئی، اس لیے ہم کسی بھی اجلاس میں شریک نہیں ہو سکے۔ چنانچہ ہم صرف یہی عرض کر سکتے ہیں کہ جو کچھ ہوا ہے وہ انتہائی خلاف معمول اور افسوس ناک تھا۔“

ہندوستان واپس جا کر فخر الدین علی احمد نے رباط کانفرنس سے اپنے ملک کی بے دخلی کی

روشنی میں ہندوستان کی خارجہ پالیسی کا نئے سرے سے جائزہ لینے کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ ہندوستان میں بڑے پیمانے پر بحث کا آغاز ہو گیا' جس پر حکومت کو اسلامی سربراہی کانفرنس میں شرکت کی کوشش کا بڑی مشکل سے دفاع کرنا پڑا۔ پریس اور لوک سبھا میں حکومتی پالیسی پر تنقید کے جواب میں وزیر خارجہ دنیش سنگھ نے ۱۵ / اکتوبر کو آل انڈیا ریڈیو پر ایک تقریر کی۔ اس میں انہوں نے تسلیم کیا کہ گزشتہ پانچ برس سے ہماری پالیسی یہ رہی ہے کہ کشمیر کے مسئلے اور ہندوستانی مسلمانوں کی حالت زار پر بحث مباحثے اور قراردادوں سے بچنے کے لیے بین الاقوامی اسلامی کانفرنسوں میں شرکت کی کوشش کی جائے۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ پاکستان کی ہمیشہ کوشش ہوتی ہے کہ ان کانفرنسوں کو کشمیر کے مسئلے پر مدد حاصل کرنے اور ہندوستانی مسلمانوں کے ناگفتہ بہ حالات پر قراردادیں منظور کرانے کا ذریعہ بنایا جائے۔ ہندوستان کو معلوم تھا کہ پاکستان رباط کانفرنس میں یہی کچھ کرے گا' لہٰذا ہندوستان کو اس کانفرنس میں شرکت کی کوشش کرنی پڑی۔

پاکستان کے دفتر خارجہ نے ۲۲ / اکتوبر کو ہندوستانی وزیر خارجہ کی تقریر کا یہ کہہ کر جواب دیا کہ "پاکستان کا سربراہ کانفرنس میں پاک بھارت تنازعات کو گھسیٹنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔" بھارتی وزیر کے اس الزام کے جواب میں کہ "پاکستان مذہبی شدت پسندی کا سہارا لے کر ہندوستان اور مغربی ایشیاء کی ترقی پسند قوتوں کے درمیان حائل ہونا چاہتا ہے" پاکستانی وزارت خارجہ کے ترجمان نے کہا کہ "اصل معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان اسلامی اتحاد کو اپنے مفادات کے لیے خطرہ تصور کرتا ہے اور اس کے خلاف اپنی کارروائیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔"

ایک پاکستانی سفارت کار نے اس پر اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ "رباط کانفرنس کے بارے میں ہندوستان کے عزائم سخت خطرناک تھے۔ ہندوستان کانفرنس میں ہر حال میں داخلہ حاصل کرنے پر تلا ہوا تھا تاکہ مسلمان ملکوں کے درمیان تفرقہ پیدا کرے' خواہ اس کے لیے سفارتی سطح پر اسے خفت کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔"

اس میں کسی شک وشبہے کی گنجائش نہیں کہ اسلامی اتحاد اور اسلامی کانفرنسوں کے بارے میں ہندوستان کی پالیسی واضح اور معین مقصد لیے ہوئے تھی۔ یعنی اسلامی بلاک کے قیام کو روکنا اور پاکستان کو کشمیر کے مسئلے پر مسلم ممالک کی حمایت سے محروم رکھنا۔ اسی طرح ہندوستانی مسلمانوں

کے حالات پر قراردادوں کی پیش بندی کا مقصد ہندوستانی حکومت کو پریشانی سے بچانا ہوتا تھا۔

اسلامی بلاک کے قیام کے بارے میں نہرو کا موقف بالکل واضح تھا' یعنی یہ کہ ''مذہبی بنیادوں پر علاقائی گروہ بندی امن کی بجائے جنگ کی طرف لے جائے گی۔''

۱۹۶۸ء میں اندرا گاندھی نے ہندوستانی موقف کا اعادہ کرتے ہوئے کہا تھا ''ہندوستان اسلامی بلاک کے کسی بھی شکل میں قیام کی مخالفت کرے گا' کیونکہ اس طرح کی مذہبی گروہ بندی اس خطے میں نئی کشیدگی پیدا کرے گی!'' انہوں نے کہا کہ بیشتر ایفروایشیائی ممالک اسلامی بلاک کے قیام کے خلاف ہیں۔

تاہم عین ممکن ہے کہ اسلامی کانفرنسوں میں شرکت کی یہ پالیسی ورلڈ مسلم کانگریس کے ۱۹۶۲ء میں بغداد میں منعقد ہونے والے اجلاس کے بعد وضع کی گئی ہو۔ عراقی حکومت نے اس اجلاس پر خصوصی توجہ دی تھی۔ عراق کے صدر جنرل قاسم نے نہ صرف اجلاس کا افتتاح کیا بلکہ اس کی پوری کارروائی کے دوران قریبی رابطہ قائم رکھا۔ کانگریس نے صدر قاسم اور عراقی وفد کو کویت کا مسئلہ نہ اُٹھانے پر بھی مائل کر لیا تھا۔ (عراق کا پورے کویت پر ملکیت کا دعویٰ تھا) اس وجہ سے یہ اجلاس بین الاقوامی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ثابت ہوا۔

اس کانفرنس میں ہندوستان کا کوئی نمائندہ شامل نہیں تھا۔ متعدد ممتاز ہندوستانی مسلمانوں کو اس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی مگر ان میں سے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ کانفرنس میں مسئلہ کشمیر اور ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے حالات پر قراردادیں منظور کی گئیں۔ پاکستانی وفد کا دعویٰ تھا کہ ان قراردادوں کے پیش کرنے یا ان کے لیے تائید حاصل کرنے اور انہیں منظور کرانے میں اس کی کوششیں شامل نہیں اور یہ سب کچھ برادر ممالک نے کیا۔ کشمیر کے بارے میں کانفرنس نے یہ موقف اختیار کیا کہ تمام عوام کو' خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے' حق خود اختیاری حاصل ہے۔ کانفرنس نے اقوام متحدہ پر زور دیا کہ وہ اپنی منظور کردہ قراردادوں پر عمل درآمد کرانے کے لیے موثر اقدامات کرے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر کانفرنس نے ہندوستانی مسلمانوں پر بار بار دہرائے جانے والے مظالم کی مذمت کی اور ہندوستانی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے ہاں مسلم اقلیت کی حفاظت' ان کے جان و مال کا تحفظ' مذہب پر عمل کرنے کی آزادی اور اپنی ثقافت کو بلا روک ٹوک ترقی دینے کے ان کے حق کو یقینی بنائے۔

یہ سمجھنا قرین قیاس ہے کہ ایک اہم نیم سرکاری کانفرنس میں ان دو قراردادوں کی منظوری نے ہندوستان کی حکومت کو اپنے دفاع اور تحفظ کے لیے ایسی پالیسی اختیار کرنے پر مجبور کردیا ہو۔ چنانچہ ہندوستان نے پہلے ۱۹۶۴ء میں مغادیشو صومالیہ میں منعقد ہونے والی ورلڈ مسلم کانگریس میں چالاکی دکھائی۔ صومالیہ نے اَن جانے میں کہہ دیا کہ بھارت بڑی خوشی سے کانفرنس میں شرکت کرسکتا ہے۔ کانگریس کے سیکریٹری جنرل سے نہ تو اس بارے میں کسی نے مشورہ کیا اور نہ اسے اطلاع ہی دی۔ جب اجلاس شروع ہوا تو وہاں ہندوستانی وفد موجود تھا۔ کانگریس کے سیکرٹیریٹ نے ہندوستانی مسلمانوں کی تین تنظیموں کو شرکت کی دعوت دی تھی۔ ہندوستانی حکومت نے انہیں وفود بھیجنے کی اجازت دینے سے انکار کردیا اور اپنا ایک وفد منتخب کر کے شرکت کے لیے بھیج دیا جس نے کانفرنس میں اپنے آپ کو ہندوستانی مسلمانوں کا وفد ظاہر کیا۔ پیشتر اس کے کہ ہندوستانی وفد کے کاغذات چیک ہوتے اور کانفرنس کو جعل سازی کا پتہ چلتا' وفد افتتاحی اجلاس میں شریک رہا۔ ہندوستانی وفد کا کہنا تھا کہ وہ صومالی حکومت کی دعوت پر شرکت کر رہا ہے۔ کانفرنس نے بتایا کہ صومالیہ کی حکومت کو شرکت کی دعوت دینے کا اختیار نہیں' صرف سیکرٹیریٹ شرکت کی دعوت دے سکتا ہے۔ چنانچہ ہندوستانی وفد کو کانفرنس سے جانا پڑا۔

یہ مسئلہ جب لوک سبھا میں پیش ہوا تو خارجہ امور کے ڈپٹی وزیر نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ صومالی حکومت کی دعوت پر ہمارا وفد شرکت کے لیے گیا تھا لیکن جب خود صومالیہ کی حکومت کے اختیار کا مسئلہ کھڑا ہوا تو اسے واپس بلالیا گیا' کیونکہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ ایک ''دوست'' حکومت کو آزمائش میں ڈالا جائے۔

ہندوستانی وفد کی سربراہی کے لیے سری نگر میں کشمیری حکومت کے ایک وزیر سید علی محمد طارق کے انتخاب سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہندوستانی حکومت نے یہ سارا ڈرامہ کشمیر کے بارے میں دنیا کو دھوکہ دینے کے لیے کھیلا تھا۔ لیکن اس کے باوجود کانفرنس نے کشمیری عوام کے حق خود اختیاری اور ہندوستان میں مسلمان اقلیت کے بارے میں قراردادیں منظور کرلیں۔

اگلے سال اپریل ۱۹۶۵ء میں حج کے موقع پر ورلڈ مسلم کانفرنس مکہ میں منعقد ہوئی۔ اس کا اہتمام ورلڈ مسلم لیگ (رابطہ عالم اسلامی) نے کیا تھا۔ رابطہ کے جنرل سیکریٹری کی طرف سے ہندوستان کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ جو وفد بھیجا گیا لیگ نے اسے قبول کرلیا' لیکن کانفرنس سے

دو ماہ قبل ہندوستانی حکومت نے دو اہم کشمیری راہنماؤں شیخ عبداللہ (جنہیں ۱۰ سال جیل میں رکھنے کے بعد کچھ ہی عرصہ پہلے رہا کیا گیا تھا) اور مرزا افضل بیگ کو حج پر جانے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ ان دونوں نے بھی کانفرنس میں شرکت کی۔

مغادیشو کی طرح مکہ میں بھی ہندوستان کو مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ اس مرتبہ مختلف ممالک کے وفود نے کانفرنس ہال کے باہر ہندوستانی پرچم کی موجودگی پر احتجاج کیا۔ چنانچہ ہندوستانی پرچم اتار لیا گیا۔ ہندوستانی سفیر نے ہندوستانی وفد کے اعزاز میں ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا تو اس میں کسی بھی غیر ہندوستانی نے شرکت نہ کی۔ کانفرنس میں شریک وفود نے دراصل ہندوستان کے ''سرکاری'' وفد کی شرکت پر ناپسندیدگی کے اظہار کے طور پر یہ رویہ اپنایا تھا' کیونکہ انہوں نے محسوس کیا کہ ہندوستانی وفد مسلمانوں کا نمائندہ نہیں۔ ہندوستان کے سرکاری وفد اور شیخ عبداللہ اور مرزا افضل بیگ کی کانفرنس میں موجودگی نے مسئلہ کشمیر کو سب سے اہم آئٹم بنا دیا۔ کشمیر کے بارے میں ہندوستان کی پالیسی کی مذمت اور کشمیریوں کے حق خود اختیاری کی تائید میں نہایت سخت اور لمبی چوڑی قراردادیں منظور کی گئیں۔ شیخ عبداللہ اور ہندوستانی مسلمان اقلیت کے ساتھ یک جہتی کے اظہار کے لیے الگ قراردادیں منظور ہوئیں۔

یہاں پنڈت نہرو کی وہ دھمکی یاد آتی ہے جس کے الفاظ یہ تھے: ''مذہب پر مبنی علاقائی گروہ بندیاں امن کی بجائے جنگ کا باعث ہوں گی۔'' اس کا ظہور اب جا کر ہوا۔ ۱۹۶۵ء کے وسط میں پاکستان میں سمجھا گیا کہ مغادیشو اور مکہ کانفرنس سے اس کی پوزیشن خاصی مضبوط ہو گئی ہے۔ ادھر شاہ فیصل نے ایک اور سربراہ کانفرنس کا اعلان کیا تو اسے مزید حوصلہ ہوا اور یہ سمجھا گیا کہ کشمیر کے مسئلے کو طاقت سے حل کرانے کا یہ موقع ہے۔ اگست ۱۹۶۵ء کا پورا مہینہ کشمیر کے اندر لڑائی ہوتی رہی' لیکن ۶ ستمبر کو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بین الاقوامی سرحد پر جنگ شروع ہو گئی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دوسری کئی باتوں کے ساتھ اسلامی یکجہتی کی پشت پناہی نے پاکستان کو اگست ۱۹۶۵ء میں کشمیر میں کارروائی کا راستہ دکھایا۔ دوسری طرف بعد میں ۱۹۶۹ء کی رباط سربراہ کانفرنس اور ۱۹۷۰ء میں منعقد ہونے والی اسلامی ممالک کے وزرائے خارجہ کی دو کانفرنسوں کی کامیابی سے ہندوستان کو یہ خدشہ ہوا کہ اسلامی یک جہتی میں اضافہ پاکستان کے لیے تحفظ کا باعث ہو گا اور ہندوستان کے لیے آئندہ طاقت کے زور پر برعظیم کی تقسیم کے خاتمے یا اس میں

ردّوبدل کا امکان باقی نہیں رہے گا۔ اس کا نتیجہ ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کی شکل میں برآمد ہوا جس میں پاکستان کا مشرقی حصّہ کٹ کر بنگلہ دیش بن گیا۔ اور یہ بھی نرا اتفاق نہیں تھا کہ ہندوستان نے مئی ۱۹۷۴ء میں پہلا ایٹمی دھماکہ لاہور سربراہ کانفرنس کے ٹھیک تین ماہ بعد کیا۔

اگلی بین الاقوامی کانفرنس اپریل ۱۹۶۹ء میں کوالالمپور میں منعقد ہوئی۔ ہندوستان کو بطور مبصر شرکت کی دعوت دی گئی۔ بعد میں اس میں تبدیلی کر کے اسے بھرپور شرکت کا موقع فراہم کر دیا گیا۔ پاکستان نے اسلامی ممالک کے اجلاس میں ہندوستانی حکومت کے نامزد کردہ وفد کی شرکت پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ ۵ ماہ بعد رباط میں ہندوستان کی شرکت اس نے اس شرط پر قبول کی تھی کہ ہندوستانی حکومت کے وفد کو مسلمانوں کا وفد قرار نہ دیا جائے۔ پاکستان کا رباط سے قبل یہ فیصلہ ہندوستان کا یہ حق تسلیم کر لینے کے مترادف تھا کہ وہ اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کا نمائندہ وفد منتخب کر سکتا ہے۔ پاکستان کو رباط سربراہ کانفرنس میں ہندوستان کی شرکت پر یہ اعتراض تھا کہ وہ مسلمان ملک نہیں ہے۔ جب صدر یحییٰ خان نے سعودی عرب کے دباؤ پر ہندوستان کی شرکت پر رضامندی ظاہر کی تھی تو اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کا نمائندہ وفد بھیجنے کی دعوت ہندوستانی حکومت کو دی جائے گی۔ یہ بات شاہ فیصل کو بھی معلوم تھی۔ چنانچہ کانفرنس کی طرف سے ہندوستانی حکومت کو ہی یہ دعوت دی گئی کہ وہ کانفرنس میں شرکت کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کا ایک وفد بھیجے۔

یحییٰ خان کو بعد میں جب یہ احساس ہوا کہ اسے واپس جا کر مظاہروں کا سامنا کرنا پڑے گا تو اس نے بہانے تلاش کرنے شروع کیے۔ بالآخر اس نے یہ عذر پیش کیا کہ اس نے ہندوستانی مسلمانوں کے منتخب کردہ وفد کی شرکت پر رضامندی ظاہر کی تھی نہ کہ ہندوستانی حکومت کے وفد پر۔ لہٰذا ہندوستان کے سرکاری وفد کی شرکت قبول نہیں کی جا سکتی۔ مذکورہ بالا رائے کو اس سے بھی تقویت ملتی ہے کہ دوسرے روز بعد دوپہر کے پہلے اجلاس میں یحییٰ خان آخر تک موجود رہے' مگر انہوں نے ہندوستانی سفیر گورچن سنگھ کی موجودگی پر کوئی احتجاج نہ کیا' حالانکہ ہندوستانی سفیر نے اپنے وفد کی طرف سے عام بحث کے دوران ایک تقریر بھی کی اور اجلاس کی پوری کارروائی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستانی وفد سے بھی غلطیاں سرزد ہوئیں۔ پہلی غلطی جس کی طرف

ہم نے اس سے قبل بھی اشارہ کیا تھا یہ تھی کہ ہندوستان کے سکھ سفیر کو وفد کے مسلمان سربراہ فخر الدین علی احمد کے پہنچنے تک کانفرنس میں شرکت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ عین اس وقت جبکہ ہندوستان میں سنگین مسلم کش فسادات جاری تھے' ہندوستان کو چاہیے تھا کہ صرف مسلمانوں پر مشتمل وفد بھیجتا۔ ہندوستانی سفیر اگر معمولی سی عقل سے بھی کام لیتے تو نہ صرف ہندوستان کا بھرم رکھ سکتے تھے بلکہ الثانیہؔ خان کے لیے مشکلات پیدا کرنے کا باعث بنتے۔ ہندوستانی وفد نے دوسری حماقت یہ کی کہ اس نے پورے ہندوستان کی نمائندگی کا دعویٰ کیا اور کہا کہ مسلم کش فسادات ہندوستان کا داخلی معاملہ ہے جسے کانفرنس میں زیر بحث نہیں لایا جاسکتا۔

ستمبر سے لے کر کانفرنس کے افتتاح تک ہندوستان اس بنا پر کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا رہا تھا کہ ہندوستان میں مسلمان سب سے بڑی اقلیت ہیں۔ ظاہر ہے اس کے علاوہ ہندوستان کے لیے' جس کی ۸۵ فیصد آبادی ہندوؤں پر مشتمل ہے' اسلامی ممالک کی کانفرنس میں شرکت کا کوئی جواز بھی نہیں تھا۔ لہٰذا ہندوستانی وفد خواہ وہ حکومت کا ہی مقرر کردہ تھا' مسلمانوں پر مشتمل ہونا چاہیے تھا۔ بالکل یہی معاملہ ۵ ماہ قبل کوالالمپور میں منعقد ہونے والی کانفرنس کے موقع پر ہو چکا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ احمد آباد میں ہونے والے فسادات کی عالمی پریس میں زبردست تشہیر ہوئی تھی اور بلاشبہ یہ نہایت ہی سنگین فسادات تھے۔ لیکن ہندوستان کی حکومت کا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔ ہندوستان سرکار کے ایک وزیر مسٹر چاون کھلے عام ایک جنگجو ہندو تنظیم ''جنگ سنگھی'' کو ان فسادات کا ذمہ دار ٹھہرا چکے تھے۔ لہٰذا اس کا امکان نہیں تھا کہ کانفرنس میں ہندوستانی حکومت کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا۔ سربراہ کانفرنس آسانی سے یہ بات مان لیتی کہ ہندوستان کی حکومت نے جو انکوائری کمیشن مقرر کیا ہے اسے یہ فیصلہ کرنے دیا جائے کہ ان فسادات کا کون ذمہ دار ہے۔ مسلم ممالک کے سربراہان زیادہ تر متاثرین کی امداد' تباہ کی گئی مساجد کی دوبارہ تعمیر اور آئندہ کے لیے مسلمانوں کے تحفظ جیسے امور سے متعلق یقین دہانی حاصل کرنا چاہتے تھے۔

ہندوستان نے یہ کہہ کر کہ کانفرنس اس پر بحث نہیں کرسکتی' جو حمایت حاصل تھی وہ بھی کھودی۔ چنانچہ کانفرنس سے ہندوستان کے نکالے جانے یا اس کی طرف سے احتجاج پر کسی ایک ملک کو بھی افسوس نہ ہوا۔ رہا یہ خیال کہ رباط کانفرنس میں شرکت سے ہندوستان کا مقصد اتحادِ اسلامی کی کوششوں

کو نقصان پہنچانا تھا' اگر ایسا ہوتا تو ہندوستانی وفد کا رویہ مختلف ہوتا۔ جب انہیں شرکت کے لیے دعوت مل گئی تھی تو پاکستان کے ساتھ محاذ آرائی میں وہ اپنے دوستوں سے ہاتھ دھونے کے لیے کبھی تیار نہ ہوتے۔ بلکہ اس لحاظ سے ہندوستانی سفیر کو داد دی جانی چاہیے کہ اصل مقاصد جو بھی تھے انہوں نے خود آگے بڑھ کر احمد آباد کے فسادات پر کانفرنس میں بات کرنے سے انکار کر دیا۔

اگر ہندوستانی سفیر ہوشیاری سے کام لیتا تو یحییٰ خان کو دو میں سے کوئی ایک راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ یعنی یا تو صاف صاف ہندوستانی وفد کی شرکت قبول کر کے اپنے اقتدار سے ہاتھ دھو لیتے' ورنہ پھر ڈٹ کر ہندوستان کی شرکت کی مخالفت کرتے' جس کا نتیجہ کانفرنس میں پھوٹ کی شکل میں برآمد ہوتا۔ ظاہر ہے یحییٰ خان یہ دوسرا راستہ اختیار کرتے۔

رباط سربراہ کانفرنس۔ ایک جائزہ

اس سے قبل گزشتہ ابواب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد متواتر یہ کوششیں جاری تھیں کہ بین الاقوامی اتحاد اسلامی کا کوئی مستقل ادارہ وجود میں لایا جائے۔ ۱۹۲۶ء کی مکہ کانفرنس' ۱۹۳۱ء کی اقصیٰ کانفرنس' ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۰ء کی اسلامی اقتصادی کانفرنسیں اور ۱۹۵۳ء تک پاکستان کی کوششوں سے منعقد ہونے والی دوسری کئی کانفرنسیں' پھر ۱۹۵۴ء کی مکہ سربراہ کانفرنس اور ۱۹۶۴ء' ۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۸ء میں بلائی جانے والی کانفرنسیں' جن کا ذکر ہم کر چکے ہیں' ان سب کا ایک ہی مقصد تھا' یعنی عالمی اسلامی اتحاد۔

بالآخر ۱۹۶۹ء میں حکومتی سطح پر یہ مقصد رباط کانفرنس سے حاصل ہو گیا۔ ۱۹۶۹ء کے بعد سے ایک مستقل ادارہ' آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس (OIC) قائم ہے' جس کا ہر سال اجلاس ہوتا ہے۔ تادم تحریر یہ تنظیم درجنوں اسلامی کانفرنسیں منعقد کر چکی ہے' جن میں سربراہانِ حکومت' وزرائے خارجہ' مرکزی بینک کے گورنروں وغیرہ کی سطح کی کانفرنسیں شامل ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ رباط کانفرنس کیسے کامیاب ہو گئی جبکہ اس سے قبل ۴۵ سال سے یہ کوششیں ناکام ہو رہی تھیں۔

اس کامیابی کے پیچھے تین عوامل کارفرما تھے۔ پہلا عامل یہ تھا کہ یہ ایک اسلامی سربراہی کانفرنس تھی۔ دورِ خلافت کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اسلامی ممالک کے سربراہان اعلیٰ ترین سطح پر جمع ہو رہے تھے۔ کانفرنس کا اس سطح پر منعقد ہونا ہی اس کا باعث بنا کہ اتفاقِ رائے کی نوبت آئی

اور اسلامی اتحاد کے لیے ایک مستقل ادارے کے قیام کا فیصلہ ہوا جس پر فی الواقع عمل درآمد کیا جاسکتا تھا۔ گویا یہ کہنا چاہیے کہ اب اس سے اوپر دنیا میں کوئی حاکم نہیں تھے جو اس فیصلے کو رد کر سکتے یا کھلم کھلا اس کی مخالفت کرتے۔

اس سربراہ کانفرنس کا کامیاب انعقاد بجائے خود دو عوامل کا مرہونِ منت تھا۔ پہلا عامل مسجد اقصیٰ میں آتش زدگی کا واقعہ تھا۔ اس سے کم تر اہمیت کا واقعہ شاید ایک سربراہ کانفرنس کے انعقاد کا سبب نہ بن سکتا۔ مصر اور اس کی قبیل کے دوسرے مسلم ممالک کو چھ روزہ جنگ کے بعد آگ لگنے کے واقعے سے پیدا ہونے والے مذہبی جذبات کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ ہو سکتی تھی، خصوصاً جبکہ سربراہی اجلاس اس واقعہ کے ایک ماہ کے اندر منعقد ہو رہا تھا۔

رباط کانفرنس سے قبل سعودی عرب کو اسلامی سربراہ کانفرنس کے لیے کوشش کرتے ہوئے پانچ سال ہو گئے تھے، لیکن آگ لگنے کے واقعہ تک سربراہ کانفرنس کے مخالفین اس تجویز کو روکنے میں کامیاب رہے تھے۔ چنانچہ آتش زدگی کے واقعہ سے ایک دم حالات سعودی عرب کے حق میں ہو گئے اور وہ عالمِ اسلام کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

پہلی کئی کانفرنسوں کے مقابلے میں رباط کانفرنس کی کامیابی کی دوسری وجہ کانفرنس کی نمائندہ حیثیت تھی۔ ۱۹۶۹ء تک مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت (روس اور چین کو چھوڑ کر) نوآبادیاتی نظام کے تسلط سے آزاد ہو چکی تھی۔ مغربی استعمار سے سب سے آخر میں الجزائر نے ۱۹۶۲ء میں آزادی حاصل کی تھی۔ افریقہ کے کئی مسلم ممالک پچاس کی دہائی کے اواخر اور ساٹھ کی دہائی کے اوائل میں آزاد ہو چکے تھے۔ مثلاً سوڈان ۱۹۵۶ء، صومالیہ ۱۹۶۰ء، گنی ۱۹۵۸ء، گمبیا ۱۹۶۵ء، دہومی ۱۹۶۰ء میں آزاد ہوا۔ مشرق وسطیٰ میں کویت ۱۹۶۳ء میں آزاد ہوا اور جنوبی یمن نے ۱۹۶۷ء میں آزادی حاصل کی۔ جنوب مشرقی ایشیاء میں ملائیشیا کو ۱۹۵۷ء اور جزائر مالدیپ کو ۱۹۶۵ء میں آزادی ملی۔ رباط کانفرنس تک روس اور چین کے علاوہ صرف جزائر کومورو، ہسپانوی صحارا اور جبوتی سامراجی نظام میں رہ گئے تھے (فلسطین، اریٹیریا اور کشمیر جیسے علاقوں کا مسئلہ بہرحال الگ تھا)۔ ۱۹۶۹ء میں رباط کانفرنس کے ذریعے ۱۹۲۴ء کے بعد کے عرصے میں پہلی مرتبہ افریقہ، مشرقِ وسطیٰ، وسط ایشیاء (ترکی، ایران اور افغانستان) جنوبی ایشیاء اور جنوب مشرقی

ایشیاء سے تعلق رکھنے والے مسلمان ممالک ایک جگہ جمع ہو رہے تھے' جس سے رباط سربراہ کانفرنس کو نمائندہ حیثیت حاصل ہو گئی۔ چونکہ اس سے قبل یہ حیثیت کسی کانفرنس کو حاصل نہیں ہوئی تھی اس لیے سابقہ اجتماعات کے مقابلے میں یہ کانفرنس کامیاب رہی۔

مسلمان حکومتوں کے درمیان یکجہتی پیدا کرنے میں رباط کانفرنس کی کامیابی کے ضمن میں ایک آخری نکتہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اس سے قبل جتنی بھی کوششیں ہوئیں ان میں اسلام کے ساتھ کچھ دوسرے مقاصد بھی پنہاں ہوتے تھے۔ جیسا کہ ۱۹۲۶ء میں سلطان عبدالعزیز ابن سعود کا مکہ کانفرنس منعقد کرانے کا مقصد حجاز پر وہابی تسلط تسلیم کرانا تھا۔ اسی طرح ۱۹۵۴ء کی مکہ سربراہ کانفرنس کو مصری حکومت نے اخوان کے خلاف اپنی حمایت کے لیے استعمال کیا۔ شاہ فیصل کی ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۹ء تک سربراہی کانفرنس منعقد کرانے کی کوششوں کا بھی اصل مقصد ناصر کے مغرب مخالف عرب نیشنلزم اور ملحدانہ سوشلزم وغیرہ کا مقابلہ کرنا تھا۔

رباط کانفرنس میں اس طرح کا کوئی معاملہ نہیں تھا۔ عرب لیگ کے وزرائے خارجہ کی میٹنگ میں اس کا فیصلہ ہوا۔ یہ فیصلہ اتفاقِ رائے سے ہوا اور تمام ممبران کی موجودگی میں ہوا۔ یہاں تک کہ عراق اور شام' جنہوں نے بعد میں کانفرنس کا بائیکاٹ کیا' کانفرنس منعقد کرنے کے فیصلے میں شامل تھے۔ ان کے بائیکاٹ کا سبب پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ ۲۱ راگست ۱۹۶۹ء کو آتش زدگی کا واقعہ پیش آیا اور ۲۵ راگست کو سربراہ کانفرنس بلانے کا فیصلہ ہو گیا۔ شاہ حسین نے عرب سربراہی کانفرنس کی تجویز ۲۱ راگست کو ہی پیش کر دی تھی۔ سعودی عرب نے عرب لیگ کی میٹنگ کے روز تک اسلامی سربراہ کانفرنس کی تجویز پر خاموشی اختیار کیے رکھی جس سے کسی ملک کو اس کے خلاف آواز اٹھانے یا اسے ''مغربی سازش'' قرار دینے کا موقع ہی نہ ملا اور کانفرنس بلانے کے حق میں فیصلہ ہو گیا۔

رباط اسلامی سربراہ کانفرنس میں ''آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس'' کی بنیاد پڑنا ایک نمایاں کامیابی تھی۔ لیکن یہ کانفرنس ایک اور لحاظ سے بھی اہم رہی' وہ یہ کہ اس میں بین الاقوامی نظام کے تحت اسلام کو بطور ایک ذیلی نظام کے سامنے لانے کا آغاز ہوا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسلام کو نہ صرف اس کے اصل مقام سے نیچے لایا گیا بلکہ مسلمان حکومتوں نے اپنے آپ کو بھی مغربی نظام کے تابع کر لیا۔ یوں گویا مغربی تہذیب کا اسلام پر غلبہ تکمیل کو پہنچ گیا۔

اسلام کو کئی صدیوں تک بین الاقوامی معاملات میں بالادستی حاصل رہی تھی۔ یہ بالادستی رفتہ

رفتہ زوال سے دوچار ہوکر بالآخر پہلی جنگ عظیم میں سلطنت عثمانیہ کی شکست اور تباہی کے بعد ختم ہوگئی۔ سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے ہونے اور عالم اسلام کے بیشتر حصے پر سامراجی تسلط کے سبب بین الاقوامی سطح پر اسلام کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ تاہم رباط سربراہ کانفرنس کے نتیجے میں یہ عمل دوبارہ شروع ہوا۔ افریقہ کے بیشتر حصوں اور ایشیاء کے ایک اہم حصے پر مشتمل خطے سے اسلام کا دوبارہ اُبھرنا غیر وابستہ تحریک کے لیے (جس کی اصل طاقت کا انحصار اسی خطے پر تھا) ایک امکانی حریف ہوسکتا تھا۔

غیر وابستگی ایک اضافی اصطلاح تھی، جو دوسری جنگ عظیم کے بعد سامنے آئی اور اس کا تعلق جنگ کے بعد کے بین الاقوامی نظام سے تھا۔ چونکہ یہ تحریک اس وقت کی صورت حال کے ردعمل کی پیداوار تھی، اس لیے یہ امکان ہر وقت موجود تھا کہ اس صورت حال میں تبدیلی واقع ہونے پر غیر وابستہ تحریک کا تصور بھی بدل جائے گا، یا ہوسکتا ہے اس کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ اس کے مقابلے میں اسلام کا تصور کسی وقتی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے نہیں گھڑا گیا تھا بلکہ چودہ سو سال سے چلا آرہا تھا اور اس کا دوبارہ ظہور بالکل فطری بنیادوں پر تھا۔ جہاں تک اسلام کی وسعت کا تعلق ہے تو غیر وابستگی کے مقابلے میں، جس کا صرف ایک سیاسی تصور تھا یا زیادہ سے کھینچ تان کر کے معیشت کو اس میں شامل کیا جاسکتا تھا، اسلام پوری انسانی زندگی کا احاطہ کرتا تھا۔ اس لحاظ سے اسلامی اتحاد کی تحریک کے سامنے کام کرنے کا ایک وسیع میدان تھا اور اس سے ممبر ممالک کو ایک مضبوط لڑی میں پرونے کا کام لیا جاسکتا تھا، جبکہ غیر وابستہ تحریک سے ایسی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

صاف بات تھی کہ بین الاقوامی معاملات میں اسلام کے عمل دخل سے غیر وابستہ تحریک کی پسماندہ ممالک کے نمائندہ ہونے کی اجارہ داری باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ دیگر وجوہات کے علاوہ یہ وہ وجہ تھی جس نے ہندوستان کو (جو غیر وابستہ تحریک کا ایک بانی رکن ملک تھا) رباط کانفرنس میں شرکت کے لیے بے چین کر رکھا تھا۔ رباط کانفرنس کا سربراہی سطح پر انعقاد اس بات کا مظہر تھا کہ اسلام کا اس خطے میں احیاء بین الاقوامی معاملات میں خاص اہمیت کا حامل ہوگا۔

اسلامی اتحاد کے فروغ کے ضمن میں رباط کانفرنس سے ایک فوری نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ کانفرنس سے قبل ماریشس کے پورے علاقے پر مراکش کا جو دعویٰ پہلے سے تھا، سربراہی کانفرنس کی خاطر اس نے اپنا یہ دعویٰ ختم کر کے ماریشس کی حکومت کو تسلیم کرلیا اور ماریشس کے صدر نے

سربراہ کانفرنس میں شرکت کرلی۔ اس طرح اسلامی کانفرنس کے آغاز ہی میں اس کے ممبر ممالک کے درمیان جھگڑوں اور محاذ آرائی کا تصفیہ کرانے اور اسلامی اتحاد کو تقویت دینے کی قوت کا مظاہرہ سامنے آ گیا۔

رباط سربراہ کانفرنس کی اہمیت اور ایک اسلامی اصولی تجزیہ

ایک اسلامی تجزیہ نگار کی رو سے گزشتہ تمام اسلامی کانفرنسوں کی طرح رباط کانفرنس اسلام کے شوریٰ کے اصول کے ذیل میں آتی ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل ہم اشارہ کر چکے ہیں' اُمت پر یہ لازم نہیں کہ وہ کسی ایک ہی قیادت میں اپنے آپ کو منظم کرے۔ اسلام میں قیادت کا ہونا ضروری ہے' ایک سے زائد قیادتیں ممنوع نہیں ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ یہ قیادت یا قیادتیں جائز طریقے سے تشکیل پائیں اور وہ صحیح معنوں میں عوام کی نمائندہ ہوں۔ اور جو اصل بنیادی مقصد ہے وہ یہ ہے کہ ان قائدین کے درمیان تعلقات اسلامی اتحاد کے قیام اور اس کے فروغ پر مبنی ہوں۔ چنانچہ اسلامی کانفرنسوں کے نتیجے میں اسلامی اتحاد کا جو ڈھانچہ سامنے آیا تھا اصولی طور پر وہ درست اور جائز تھا۔

تاہم اس نظام کی کارکردگی کا جائزہ لینے سے دو مشکلات کا احساس ہوتا ہے۔ ایک کا تعلق خود ان اکائیوں سے ہے جن پر یہ نظام مشتمل تھا' اور دوسری کا تعلق ان اکائیوں کی نمائندگی کرنے والی قیادت کے اسلام کی رو سے قانونی جواز' اس کی حقیقت اور اس کے وصف سے ہے۔ لہٰذا ہم مسلمان ممالک اور وہاں کی قیادت کی طرف آتے ہیں۔

رباط میں عالم اسلام کی نمائندگی ۲۵ مسلمان ممالک نے کی۔ لیکن کیا سیکولر ممالک اُمت کے نمائندے کہلانے کے حق دار ہو سکتے ہیں؟ راقم کا خیال ہے کہ اسلام کے حکومتی نظام کے تحت جب تک کسی ملک کی حکومتی پالیسیاں واضح طور پر اسلام کے فروغ کے لیے تشکیل نہ پا رہی ہوں اس ملک کو اُمت کا حصہ کہلانے کا کوئی حق نہیں۔

دوسری مشکل یہ ہے کہ بیشتر مسلمان ممالک میں خاصی بڑی تعداد میں اہم غیر مسلم اقلیتیں موجود ہیں اور بعض جگہوں پر یہ اقلیتیں مسلمان آبادی کا اہم حصہ ہونے اور ملکی معاملات میں شمولیت کے ساتھ ساتھ اسلام کے بارے میں متضاد ہی نہیں منفی رویہ رکھتی ہیں۔ چونکہ قومیت کے تصور پر استوار اسلامی حکومتیں پورے ملک کی نمائندہ ہوتی ہیں' اس لیے ان کے لیے اسلام کی

نمائندگی کرنا اور اس کے مفادات کو پیش نظر رکھنا دشوار ہوتا ہے۔

یہاں اسلامی قومی ریاستوں کے درمیان پائے جانے والے تعلقات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ اگر معاملہ یہ ہے کہ اسلامی کانفرنس میں شامل ممالک کے ہاں رائج نظام کا فرق محض فرائض کی بجا آوری کے لیے ہے اور تنظیمی حوالے سے سہولت کے طور پر اختیار کیا گیا ہے تب تو ان ممالک پر مشتمل اسلامی کانفرنسوں کا سلسلہ چل جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ آئندہ مضبوط ہوتا چلا جائے۔ لیکن جن ممالک نے مغربی طرز معاشرت کے زیر اثر آنکھ کھولی اور اس کے نتیجے میں تصادم، جنگ و جدل، تفرقہ بازی اور رقابت ہی ورثے میں پائی، بلکہ اس سے بھی آگے وہ سیاسی نظریہ بھی اپنا لیا جس میں آفاقی عقائد اور اقدار کی جگہ فلسفے کے زور پر سیکولرزم اور نیشنلزم نے لے لی ہے، تو ظاہر ہے کہ ایسی قومی ریاستوں کا اسلامی نظام کے ساتھ مطابقت پیدا کرنا ممکن نہیں۔

جب قوم پرستی اور قومیت پر مبنی ریاستی نظام کا تصور عالم اسلام میں داخل ہوا تھا تو یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اس سے عالم اسلام متحد ہونے کی بجائے منتشر ہو گا۔ چنانچہ جیسا کہ اس سے قبل ہم بحث کر چکے ہیں، ۱۹۲۴ء میں جب خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد ۱۹۲۶ء میں الازہر کی طرف سے ایک خلافت کانگریس کا اہتمام کیا گیا تو اس میں یہ بات کھل کر سامنے آ گئی تھی کہ مسلمانوں میں قوم پرستی کا زہر اس درجے سرایت کر چکا ہے کہ کسی نئے خلیفہ کے تقرر کے لیے کوشش کامیاب ہونا محال ہے۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۶۹ء تک کسی نہ کسی شکل میں اسلامی اتحاد کے لیے جو بھی کوشش ہوئی، قوم پرستی اور سیکولرزم کے زیر اثر قومیت کی بنیاد پر اسلامی ریاستوں کے تصور نے اسے ناکام بنا دیا۔ اگر ان کوششوں کو بالآخر رباط کانفرنس کی شکل میں پذیرائی حاصل بھی ہوئی تو یہ اسلامی قومیت کی بنیاد پر قائم ریاستوں کا کارنامہ نہیں تھا بلکہ اسلام کا ایک عالمگیر تصور اس کا سبب تھا، جسے مسجد اقصیٰ کے واقعہ سے مہمیز ملی تھی۔ اس کے علاوہ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں عربوں کی شکست سے بھی (وطنی) قومیت کی بنیاد پر ریاستوں کے قیام کے تصور پر کاری ضرب لگ چکی تھی۔

اسلامی کانفرنسوں میں شریک ممالک کی قومیت پرستی اور سیکولرزم کی بنیادیں اگرچہ کمزور پڑ گئی تھیں لیکن اسلام کے حقیقی نظام سے ابھی وہ کوسوں دور تھے، کیونکہ نظام اسلام کے تحت عالم اسلام کا قومی ریاستوں سے بالاتر کوئی ڈھانچہ قائم ہونا ناگزیر ہے۔ راقم اس بارے میں ڈاکٹر کلیم

صدیقی کے اس موقف کا پوری طرح حامی ہے کہ قومیت پر مبنی ریاستی تصور ہمیشہ قائم نہیں رہے گا۔ لہٰذا مسلمانوں کو اسلامی قومی ریاستوں سے ہٹ کر کوئی نظام وضع کرنا چاہیے۔

آخری لیکن نہایت اہم بات یہ ہے کہ رباط میں موجود بیشتر سربراہانِ مملکت اور حکومت (یا ان کے نمائندے) اسلام کی رو سے عوام پر حکمرانی کے قانونی تقاضے پورے نہیں کرتے تھے۔ اس لیے وہ کانفرنس میں عوام کی صحیح نمائندگی کرنے سے قاصر رہے۔ اسلام میں قیادت کا کم سے کم تقاضا، جس کے بارے میں کسی کو بھی اختلاف نہیں، یہ ہے کہ عوام کی مرضی کے بغیر ان پر قیادت نہیں ٹھونسی جاسکتی۔ اس حوالے سے رباط میں موجود اسلامی ملکوں کے قائدین کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یا تو وہ خاندانی بادشاہتیں تھیں یا فوجی آمریتیں، دیگر آمریتیں یا آمریتوں ہی کی اقسام تھیں۔ بہرحال جہاں تک اسلامی نظریے کا تعلق ہے، یہ تمام غیر قانونی حکومتیں تھیں۔

چنانچہ نظام اسلام کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کے لیے عالم اسلام کو موزوں قیادت لانے کے لیے زبردست جدّ وجہد کی ضرورت ہے، جس کے نتیجے میں یقینی بات ہے کہ مسلمان ممالک کی وہ شکل نہیں رہے گی جو اس وقت ہے۔ اسلامی قیادت لانے کے لیے جو بنیادی سوال امت کو پیش نظر رکھنا ہوگا وہ یہ ہے کہ کیا بالغ حق رائے دہی پر مبنی جمہوری نظام، بلالحاظ مذہب سیکولر جماعتی نظام اور اس نظام کے تحت انتخابات کے ذریعے اسلامی قیادت لائی جاسکتی ہے؟ ایک عظیم اسلامی مفکر اور مصنف مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہاں، مغربی جمہوری نظام کو کام میں لاکر اسلامی قیادت لائی جاسکتی ہے۔ چنانچہ وہ اور ان کی جماعت، جماعت اسلامی قیامِ پاکستان کے بعد سے اس نظام کے تحت پاکستان کو اسلامی مملکت میں ڈھالنے کی جدّ وجہد میں لگی ہوئی ہے۔ مگر ان کی ستر سال کی جدّ وجہد کا نتیجہ صفر ہے۔

اس کے برعکس آیت اللہ خمینی کی قیادت میں ایران میں جو جدّ وجہد ہوئی اس کا بالکل ایک مختلف نتیجہ سامنے آیا۔ آیت اللہ خمینی نے جو حکمت عملی اختیار کی وہ یہ تھی کہ مروّجہ نظام کے خلاف اپنے مقاصد کو آگے بڑھایا جائے۔ چنانچہ ایرانیوں کو جو کامیابی حاصل ہوئی وہ ثابت کرتی ہے کہ جدید حکومتی نظام سے ٹکر لیے بغیر اسلامی نظام کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔